مذہب

اہلِ سنت والجماعت

اس کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ اور ان کی شرعی حیثیت

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

(وفات ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء)

ادارۂ احیاء علم و دعوت۔ لکھنؤ

مذہب اہلِ سنت والجماعت

اور

اس کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ اور ان کی شرعی حیثیت

از

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مرتب

عبدالعلیم خطیب ندوی

ناشر

ادارۂ احیاءِ علم ودعوت۔لکھنؤ

رفعت منزل، ۱۸۵/۲۸۵، لکڑمنڈی، ڈالی گنج، لکھنؤ، موبائل ۳۲۲۳۴۱۱-۰۵۲۲

پہلا ایڈیشن

سلسلۂ مطبوعات (۲)

نام کتاب:............................ مذہب اہل سنت والجماعت

مصنف:............................ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مرتب:............................ عبدالعلیم خطیب ندوی بھٹکلی

صفحات:............................ اسی (۸۰)

سنہ اشاعت:............................ ذوالقعدہ ۱۴۲۵ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۴ء

کمپوزنگ:............................ صابر باشاہ خطیب بھٹکلی

طباعت:............................ کاکوری آفسٹ پریس لکھنؤ

تعداد اشاعت:............................ ایک ہزار (۱۰۰۰)

باہتمام:............................ انیس احمد ندوی

قیمت:............................ ۲۰/روپے

ناشر

ادارۂ احیاء علم ودعوت

رفعت منزل، ۱۸۵/۴۸۵، لکڑ منڈی، ڈالی گنج، لکھنؤ، موبائل ۳۲۲۳۴۱۱-۰۵۲۲

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، لکھنؤ

مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنؤ

الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

مکتبہ ابوالحسن ۴/۸۲، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۳۰، بھٹکل ۵۸۱۳۲۰

فہرست

مذہب اہل سنت والجماعت

۱	عرض ناشر	۵
۲	اہل سنت والجماعت کے دو بنیادی عناصر	۷
۳	معنوی حقائق کے لیے لفظی تعبیرات کی اہمیت	۸
۴	الفاظ کی حفاظت کے لیے کتابت کی ضرورت اور اس کا اہتمام	۹
۵	تلفظ وقرأت کا بنیادی مقام	۱۱
۶	معلم کتاب اور اس کی ضرورت	۱۲
۷	مُنزل من اللہ قانون کے لیے مبعوث من اللہ شخصیتیں	۱۶
۸	کتاب اور صاحب کتاب کی حیثیت	۱۷
۹	غور وفکر کا دائرہ	۱۷
۱۰	حکمت اور فلسفے کا فرق	۱۸
۱۱	عالم کے مستند ہونے کا معیار	۱۸
۱۲	عالم ومعلم کا اٹوٹ رشتہ	۲۱
۱۳	شیخ کامل کی ضرورت	۲۱
۱۴	صحابۂ کرام اور صحبتِ نبوی	۲۳
۱۵	اسلاف میں لفظِ صحبت کا التزام	۲۴
۱۶	اتباع اور صحبت کا باہمی ربط	۲۵
۱۷	محدثین کے نزدیک صحبت کی اہمیت	۲۶
۱۸	اصلاحِ نفس کے بغیر اصلاحِ خلق کا انجام	۲۶
۱۹	غیر تربیت یافتہ عالم ومصلح کا فتنہ	۲۷
۲۰	تزکیۂ نفوس کاغذی نقوش کے ذریعے ممکن نہیں	۲۸
۲۱	شخصیات کی اندھادھند پیروی کا نتیجہ	۲۹
۲۲	علم کتاب کی ضرورت	۲۹
۲۳	معتدل مسلک ومذہب کی بنیاد	۳۰
۲۴	ہدایت کے دو عنصر	۳۰
۲۵	دین کے چار بنیادی شعبے	۳۲
۲۶	عناصر ہدایت کا عقلی تجزیہ	۳۳
۲۷	تاریخ عالم سے استدلال	۳۴
۲۸	حضرت نوح اور ان کی قوم	۳۴
۲۹	قوم عاد کا معاملہ	۳۵
۳۰	قوم ثمود کی ہٹ دھرمی	۳۶
۳۱	قوم ابراہیم کا منکر طبقہ	۳۶

۳۲	قوم شعیب کی صورتِ حال	۳۷
۳۳	حضرت موسیٰ اور قوم فرعون	۳۸
۳۴	سرکشی کے اسباب	۳۸
۳۵	عناصر ہدایت کے معیار سے امت محمدیہ کے طبقات	۳۹
۳۶	یہود کی خود پرستی اور اس کے نتائج	۴۰
۳۷	نصاریٰ اور شخصیت پرستی	۴۴
۳۸	اندھا دھند محبت وعقیدت کا انجام شرک ہے	۴۵
۳۹	کتاب اور معلم کتاب میں تفریق کا نتیجہ	۴۷
۴۰	امت محمدیہ میں امم سابقہ کی مشابہت	۴۷
۴۱	ہم رجال ونحن رجال	۴۹
۴۲	روشن خیال طبقے کا نظریہ	۵۰
۴۳	خوارج اور اس کے ہم خیال فرقے	۵۰
۴۴	عقل وخرد کی نیرنگیاں	۵۲
۴۵	امتِ مسلمہ اور شخصیت پرستی	۵۳
۴۶	یہود ونصاریٰ کی مشابہت	۵۵
۴۷	کتاب وسنت کے جمع رکھنے کی تاکید	۵۶
۴۸	اتباع سلف کی ضرورت اور خودرائی کی ہلاکت خیزی	۵۷
۴۹	اہل سنت والجماعت کمال اعتدال کا نقیب	۵۹
۵۰	محبتِ صحابہ تکمیل ایمان کی علامت	۶۰
۵۱	محبت وتنقید کا تضاد	۶۰
۵۲	صحابہ معیارِ کامل	۶۱
۵۳	ترجیح اور تنقید کا فرق	۶۲
۵۴	مجتہدین ملت اور علمائے ربانی کا مقام	۶۳
۵۵	اہل سنت والجماعت دین حق کا حقیقی ترجمان	۶۴
۵۶	اہل سنت والجماعت کی لفظی حقیقت	۶۵
۵۷	''السنہ'' کی توضیح	۶۷
۵۸	الجماعۃ کی تحقیق	۶۸
۵۹	ما أنا علیہا کا مفہوم	۷۰
۶۰	فرقۂ ناجیہ	۷۱
۶۱	اہل سنت والجماعت کی معنوی جامعیت	۷۲
۶۲	خودساختہ جماعتیں اور خودساختہ القاب	۷۴
۶۳	اسلام کا مظہر اول اور موردِ کامل	۷۴
۶۴	اہل سنت والجماعت مکمل اسلام کی ترجمان ہے	۷۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا ایک مضمون ہے، جو انھوں نے زندگی کے آخری ایام میں لکھا تھا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا تھا، درحقیقت یہ ان کی آخری تصنیف ''علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' کا تمہیدی باب ہے۔ اس میں حضرت قاری صاحب نے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دل نشیں استدلالی انداز میں مذہب اہلِ سنت والجماعت کے ترکیبی عناصر کا جائزہ لیا ہے اور ان کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انسانی زندگی میں کتابِ الٰہی اور اس کے ساتھ معلمِ کتاب اور مربی کی ضرورت، یا بالفاظ دیگر الٰہی قانون اور قانون کو تطبیق دینے والی شخصیت کی ضرورت پر نقلی اور عقلی دلائل کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اسی طرح عناصرِ ہدایت (کتاب اور صاحبِ کتاب یا قانون اور مربی) کا عقلی تجزیہ کر کے گزشتہ امتوں کے حالات سے مثالیں پیش کی ہیں، اور ان عناصر ہدایت سے روگردانی اور انحراف کے لحاظ سے اس امت کی صورت حال کا ذکر کیا ہے، پھر شخصیت پرستی اور کورانہ عقیدت کا انجام بیان کیا ہے، اور اہل سنت والجماعت کو کمالِ اعتدال کے نقیب کے طور پر پیش کیا ہے۔ مرادِ شریعت کی تعیین میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اہمیت اور ان کے صحبت یافتہ و تربیت یافتہ راسخین فی العلم، مجتہدینِ ملت، علمائے ربانی اور مشائخِ حقانی کے مقام پر روشنی ڈالی ہے۔ اخیر میں اہل سنت والجماعت کی لفظی حقیقت اور اس لقب کی معنوی

جامعیت اور خود ساختہ القاب کی بے حقیقتی سے بحث کی ہے۔ اس طرح اس میں بہت سے نادر مضامین آگئے ہیں۔ حضرت قاری صاحبؒ نے اہل سنت کے عناصر ترکیبی اور اس لقب کی لفظی و معنوی حیثیت پر جو مجتہدانہ کلام کیا ہے، وہ بے نظیر ہے۔ ہر عالم اور داعی کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ مدارس اسلامیہ میں جہاں عقائد اور اسلامی فِرَق و مذاہب کا مضمون پڑھایا جاتا ہے، ان طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ لازمی کر دیا جائے تو مفید ہوگا۔

یہ مضمون، کتاب مذکور کا ایک باب ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت محدود تھی، ضرورت تھی کہ اس کی اشاعت عام کی جائے۔ ادارہ احیاء علم و دعوت کا اولین مقصد چوں کہ قدیم کتابوں اور مفید مضامین کی تحقیق و اشاعت ہے، اس لیے اس مضمون کو از سر نو مرتب کر کے شائع کرنا اس نے ضروری سمجھا۔ اب اس مضمون میں ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں اور احادیث و آثار کی تخریج کی گئی ہے، بعض جگہوں پر کتابوں کا حوالہ موجود تھا، مضمون میں اس کو باقی رکھتے ہوئے حواشی میں اصل مصادر کا حوالہ دیا گیا ہے، جن آیات کی تخریج نہیں تھی ان کی تخریج کی گئی ہے۔ ترتیب و تخریج کا یہ کام زیادہ تر ہمارے رفیق مولوی عبد العلیم خطیب ندوی بھٹکلی نے انجام دیا ہے، ہم ان کے نہایت مشکور ہیں، ہم مولانا عبد العزیز صاحب ندوی بھٹکلی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے اس مضمون کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ اخیر میں کتاب ھذا کے آخری حصے کے مضمون سے ملتے جلتے ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب رسالۃ اہل السنت والجماعت سے ماخوذ ہے۔

فیصل احمد ندوی

۳/شوال ۱۴۲۵ھ

اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلکی ذوق کو سمجھنے کے لیے جس میں کمالِ اعتدال وتوسط کا جوہر پیوست ہے، ان کے اس مسلکی لقب (اہل السنۃ والجماعۃ) پر ہی غور کر لیا جانا کافی ہے، جس سے اس کی بنیادیں خود بخود کھل کر سامنے آجائیں گی اور اس کی نوعیتِ اعتدال وتوسط اور جامعیت بھی نمایاں ہو جائے گی۔

اہل سنت والجماعت کے دو بنیادی عناصر

یہ لقب دو کلموں سے مرکب ہے ایک السنۃ اور ایک الجماعۃ، ان دونوں کے مجموعہ ہی سے ان کا مسلک بنتا ہے، تنہا کسی ایک کلمہ سے نہیں؛ السنۃ کے لفظ سے قانون، دستور، طریقِ ہدایت اور صراطِ مستقیم کی طرف اشارہ ہے جس پر چلنے کا امت کو امر کیا گیا ہے۔

هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله
(الانعام ۱۵۳)

"یہ میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی"

اور الجماعۃ کے لفظ سے ذواتِ قدسیہ، شخصیاتِ مقدسہ اور اہل صدق وصفا رہنمایانِ طریق کی طرف اشارہ ہے، جن کی رہنمائی اور معیت وتربیت میں اس صراطِ مستقیم اور راہِ تقویٰ پر چلنے اور اسے سمجھنے کا امر کیا گیا ہے۔

یا أیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین (التوبہ ۱۱۹)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو"

جس سے واضح ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر ذوات کے، اور ذوات بغیر اصول وقوانین کے معتبر نہیں، جب کہ قوانین خود ہی ان ذوات کے ذریعے ہم تک پہنچے ہوئے ہیں، اور خود ذوات بھی ان قوانین ہی کے ذریعے پہچانی گئیں اور واجب الاعتبار بنیں۔

معنوی حقائق کے لیے لفظی تعبیرات کی اہمیت

مذہب یا مسلک کے ان دو بنیادی عناصر (قانون وشخصیت) کو تعلیم دین اور سماوی قانون میں جمع رکھے جانے کی کھلی وجہ یہ ہے کہ معنوی حقائق اپنی ہی مخصوص تعبیرات میں لپٹی ہوئی اور گندھی ہوئی ہوتی ہیں، ذرا سا بھی تعبیر میں ردوبدل یا تغیر ہو جائے تو اس کی اندورنی حقیقت ہی بدل کر کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، اور متکلم کا منشا اور مقصد فوت ہو جاتا ہے؛ اسی لیے دنیوی قوانین میں بھی قانون ساز مجلسیں وضع قانون کے وقت ایک ایک جملے پر ہفتوں بحث کر کے قانون کے الفاظ متعین کرتی ہیں کہ ان الفاظ ہی میں منشائے قانون چھپا ہوا ہوتا ہے، جس پر ملکوں اور قوموں کے معاملات کے فیصلے کیے جاتے ہیں، گویا حکومتیں بھی قانون کے الفاظ وتعبیرات ہی پر چل رہی ہیں۔ اگر قانون کے الفاظ میں ذرا سا بھی نقص یا کوئی ردوبدل ہو جائے تو دنیا کی بساطِ سیاست الٹ جاتی ہے اور عظیم عظیم انقلابات رونما ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا کے ان عارضی اور چندروزہ معاملات، مقدمات اور خصومات کا مدار، قانون کی تعبیرات اور الفاظ کی وضعی نشستوں پر ہے، تو آخرت کے ابدی اور دائمی معاملات کا معاملہ تو دنیا کی نسبت سے کہیں زیادہ اہم اور نازک ہے۔ اگر اس اخروی قانون کے خدائی کلمات،

غیبی تعبیرات اور مذہبی اصطلاحات نازل نہ ہوں یا محفوظ نہ رہیں یا بدل جائیں تو وہ حقیقتیں بھی باقی نہیں رہ سکتیں، جو ان الفاظ میں مخفی تھیں، جس سے ہدایت اور نجاتِ آخرت کا کارخانہ ہی درہم برہم ہوسکتا ہے؛ اس لیے حق تعالیٰ نے ہر دور میں اپنا قانون اپنی ہی تعبیرات اور اپنے ہی فرستادوں کی تعبیرات والفاظ میں اتارا اور اس کی حفاظت کا انتظام فرمایا تا کہ اس کی مطلوبہ حقیقتیں اپنے ہی الفاظ کے ذریعے محفوظ رہیں اور بھول چوک کے وقت ان الفاظ کا سامنے لے آنا ہی حقیقتوں کی یادداشت اور تذکرکا ذریعہ بنتا رہے۔

ظاہر ہے کہ اگر قانونِ خداوندی یا کتابِ الٰہی کی لفظی تعبیرات نہ اترتیں، تو قانون کے معانی اور مشمولات ومضمرات کا فہم وبقا ، اور بھول چوک کے وقت اس کی یادداشت کی کوئی صورت نہ ہوسکتی، جب کہ بہت سے معانی ومقاصد خدائی کلام کی عبارت سے برآمد ہوتے ہیں، بہت سے اس کے اسلوبِ بیان کی دلالت واشارت سے نمایاں ہوتے ہیں، اور بہت سے اس عبارت کے مقتضیات سے کھلتے ہیں، جو ان بلیغ تعبیرات کے سامنے نہ ہونے سے کبھی نہ کھل سکتے۔ غرض جب تک وہ تعبیراتِ الٰہی اپنے ہی اسلوب سے سامنے نہ آئیں، ان کے مدلولات کھلنے کی صورت ممکن نہیں۔

الفاظ کی حفاظت کے لیے کتابت کی ضرورت اور اس کا اہتمام

قرآن کریم آخری آسمانی کتاب تھی جو قیامت تک کے لیے بھیجی گئی تھی؛ اس لیے اس کی لفظی تعبیرات بھی خدا ہی کی طرف سے اتاری گئیں اور ان کی حفاظت کی گارنٹی بھی خدا ہی کی طرف سے لی گئی؛ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی، بل کہ قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن یعنی احادیثِ نبویہ کے حفظ وکتابت کا بھی وہی، بل کہ اس سے زیادہ اہتمام کیا گیا، کہ وہی درحقیقت قرآنی معانی ومرادات کی علمی وعملی تشریح اور ان

کی اولین تفسیر تھی، تا کہ اس کے ذریعے قرآنی قانون کے مفہومات اور حقیقی مرادات ذہنوں میں آئیں اور جاگزیں ہو جائیں؛ اس لیے انہیں بھی قرآن کی طرح سینوں اور پھر سفینوں میں منضبط کیا گیا، کہ اس کے بغیر مراداتِ ربانی کا فہم ممکن نہ تھا؛ اس لیے ان الفاظ وتعبیرات کا محض نازل کر دیا جانا ہی کافی نہیں سمجھا گیا، بل کہ ان کی قلمی یادداشت اور نوشت وخواند کا بندوبست بھی کیا گیا، تا کہ یہ یادداشت اور کتابت شدہ قانون، بھول چوک یا ذہول وغفلت کے وقت ذریعۂ ذکرو تذکر ثابت ہو، اس لیے نزولِ الفاظ کے بعد ان کی کتابت کا بھی انتہائی حفاظت کے ساتھ بندوبست کیا گیا، جب کہ معانی کی حفاظت کا مدار الفاظ ہی کی حفاظت پر تھا اور اس کی صورت نوشت وکتابت ہی تھی، بقول مثل معروف: "العلم صید و الکتابة قید"۔

چناں چہ سب سے پہلے حق تعالیٰ ہی نے اپنی ان تعبیرات کو قلم اعلیٰ سے لوحِ محفوظ میں قلم بند فرمایا اور پھر بلفظہٖ انہیں تعبیرات کو پیشانیِ اسرافیل پر لکھا اور پھر بصورت مکتوب بیت العزت میں اتارا، جو آسمانِ دنیا پر ایک رفیع المرتبت مقام ہے اور وہاں سے پھر زمین پر انہی الفاظ کے ساتھ یہ کلام نجماً نجماً (ٹکڑے ٹکڑے) کر کے قلبِ نبوت پر نازل کیا گیا، گویا علویات میں سب سے اوپر بھی یہی الفاظ لکھے گئے، اور سفلیات میں سب سے نیچے زمین پر اتار کر بھی وہی الفاظ لکھوائے گئے، تا کہ بالا و پست کے سارے دائروں میں یہ الفاظ بقیدِ حیات منضبط رہیں؛ پھر حضرتِ اقدس ﷺ نے اسے لسانِ نبوت سے پڑھ کر سنایا بھی اور بلفظہٖ تلاوت فرما کر اپنے صحابہ کے قلوب تک پہنچایا بھی۔

پھر اسی سنتِ الٰہی کے مطابق آپ نے ان قرآنی آیات اور ان کی تعبیرات کے

بلفظہٖ لکھائے جانے کا پورا پورا اہتمام بھی فرمایا، اور صحابہ کرام کی ایک مبصر جماعت کو کتابتِ قرآن پر مامور فرمایا؛ یہاں تک کہ عہدِ صدیقی اور عہدِ عثمانی میں انہی نوشتوں کی جمع وترتیب بصورتِ مصحف اسی ترتیب سے کی گئی جس ترتیب سے وہ حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں منتشر اوراق واحجار اور چرمی الواح پر کتابت شدہ موجود تھے، تاکہ وہی خدائی تعبیرات ان نوشتوں کے ذریعے امت تک پہنچیں اور قیامت تک واسطہ در واسطہ پہنچتی رہیں۔

ظاہر ہے کہ جب انہی تعبیرات میں معانی ومراداتِ خداوندی، نیز ذات وصفاتِ الٰہیہ کے کمالات پنہاں تھے، جن کے دیکھنے کا آئینہ بھی الفاظ ونقوش تھے، تو انہی سے وہ علمی وعرفانی کمالات بھی ذہنوں تک پہنچ سکتے تھے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

تلفظ وقرأت کا بنیادی مقام

غرض نزولِ وحی کے سلسلے میں اولین درجہ الفاظ کے تلفظ اور قرأت کو دیا گیا، پھر انہیں لوحِ محفوظ میں کتابت سے محفوظ کیا گیا، پھر پیشانیِ اسرافیل پر انہیں لکھا گیا، پھر اس نوشتے کو بیت العزت میں اتار کر محفوظ کیا گیا، پھر قلبِ نبوت پر اتارا گیا، پھر آپ کے ذریعے اسے دنیا میں لکھوایا گیا، پھر صحابۂ کرام نے تدوین وترتیب کے ساتھ انہیں یکجا کیا اور مصحف کی صورت دی؛ جس سے واضح ہے کہ نزول وقرأت اور حفاظت وکتابت وغیرہ میں اولین درجہ الفاظ ہی کو دیا گیا جن پر سارے معانی ومقاصد اور حقائق ومعارف کا مدار تھا، یہاں تک کہ ان کا مجموعہ کتاب کی صورت سے دنیا میں پھیل گیا اور اسے ”کتاب اللہ“ پکارا گیا، اس لیے اس کلامِ خداوندی کا لقب ایک

طرف تو قرآنِ مبین فرمایا گیا جو عالم بالا و پست میں پڑھا گیا، اور دوسری طرف اس کا لقب کتابِ مبین بھی ارشاد ہوا جو عالم علوی و سفلی میں لکھا بھی گیا۔

معلم کتاب اور اس کی ضرورت

البتہ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ کلام کتنا بھی جامع، کامل اور بلیغ تر، بل کہ کلامی معجزہ اور اعجازی طور پر محفوظ بھی ہو، پھر بھی وہ جب بھی دنیا میں آیا تو کسی شخصیت ہی کے ذریعے آیا ہے، شخصیت ہی نے اسے پہنچایا اور اسی نے اسے پڑھ کر سنایا ہے، نہ یہ کہ کلام خداوندی پہاڑی اور پتھروں پر اتر آیا ہو، جو نہ سن سکتے ہیں نہ سنا سکتے ہیں، نہ پڑھ سکتے ہیں نہ پڑھا سکتے ہیں؛ جس سے واضح ہے کہ کلام کے الفاظ و تعبیرات پہنچائے جانے اور ان کی مراد فہمی کے لیے کتاب اور اس کے نقوش سے زیادہ معلم کتاب کی شخصیت ناگزیر ہے جو اسے سنا کر سمجھائے اور مرادات پر مطلع کرے۔

مزید غور کیا جائے تو شخصیتوں کی ضرورت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کلام کی بہت سی خصوصیات ہیں جو متکلم کے لب و لہجے، اندازِ بیان، طرزِ ادا، کیفیتِ تفہیم اور کلامی حرکات و سکنات ہی سے مفہوم ہو سکتی ہیں، کاغذ یا اس کے نقوش و حروف میں نہ یہ کیفیات مرتسم ہو سکتی ہیں نہ نقش کی جا سکتی ہیں، جب تک کہ متکلم یا معلم اور اس کی کلامی ہیئتیں سامنے نہ ہوں، اور وہ اسی لب و لہجے اور انہیں صوتی کیفیات و حرکات کے ساتھ کلام کو ادا نہ کرے جو اس کلام کی مراد فہمی کے لیے طبعاً ضروری ہیں، تو کلام کی واقعی مراد محض کاغذ یا نوشتہ سے کبھی نہیں کھل سکتی۔

ساتھ ہی کلام کا سرچشمہ کیفیاتِ باطنیہ ہوتی ہیں جن سے کلام سرزد ہوتا ہے، اور انہی کے مطابق متکلم کا لب و لہجہ اور اس کی ہیئتِ تکلم بھی فطرتاً ایک خاص صورت

اختیار کرلیتی ہے، ایک ہی جملہ غضب ناک لب ولہجے سے آنکھیں نکال کرادا کیا جائے تو اس کے معنی ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکنے کے ہوتے ہیں، خواہ لفظ کتنے ہی نرم اور شائستہ ہوں، اور وہی جملہ شفقت آمیز اور لطف خیز لب ولہجے سے آنکھ نیچی کر کے ادا کیا جائے تو اس کے معنی مہر وعنایت اور لطف وکرم کے ہوتے ہیں، خواہ لفظ کتنے ہی سخت اور درشت ہوں۔ اسی طرح تعجب کی حرکت متعجبانہ لب ولہجے سے ادا ہو تو کلام تعجب انگیز ہوگا، حیرت کی ہیئت سے ادا ہو تو حیرت افزا ہوگا، دار وگیر کا لہجہ ہو تو تعزیری ہوگا، مہر ووفا کا لہجہ ہو تو وفورِ محبت کا اظہار ہوگا اور استفساری لہجہ ہو تو سوال سامنے آئے گا؛ غرض جیسی ہیئتِ تکلم اور جیسی کیفیتِ ادا اور جیسی آواز کی نوعیت ہوگی، ویسی ہی کیفیتِ باطنی سے وہ سرزد ہوگا اور ویسے ہی اس کے معنی ہوں گے، اور وہی وہاں مراد ہوں گے۔ بہر حال، کلام جب اپنی باطنی کیفیات سے برآمد ہوتا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کلام میں وہ کیفیات مستور نہ ہوں، اور تکلم کے وقت وہ کوئی خاص ہیئت اختیار کر کے نہ ابھریں!

خلاصہ یہ کہ الفاظ ہر جگہ خواہ ایک اور یکساں رہیں، مگر اندرونی کیفیات کے سبب لب ولہجہ، اندازِ سخن اور ہیئتِ تکلم متکلم ہی کی اندرونی کیفیات کے مناسبِ حال صورت پذیر ہوتی ہے؛ اگر وہ بدل جائے تو معانی بھی بدل جاتے ہیں اور حقیقت بھی کہیں کی کہیں جا پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لب ولہجہ، یہ متکلم کی کلامی ہیئت، یہ آنکھوں کی گھوریا شرمیلاپن، یہ آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور ان کے ساتھ جذبات وکیفیاتِ نفس کا یہ معنوی نقشہ اور اس کا خاص کلام ہیئت سے اظہار، نہ کاغذ میں آسکتا ہے، نہ حروف ونقوش کی کششوں میں سما سکتا ہے، صرف متکلم کی ذات اور شخصیت ہی سے عیاں ہوسکتا ہے؛ اس لیے محض الفاظ ہی کی حد تک نہیں، معانی کی حد تک بھی

شخصیت کی ضرورت ناگزیر ہے

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

پھر اسی کے ساتھ کلام خداوندی کی مرادات کے نیچے باطنی حقائق کا بھی ایک عظیم ذخیرہ چھپا ہوا ہوتا ہے، جن سے مخاطب کو مقاصد کی تہ تک پہنچانا اور اس کے علم میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے؛ اور آگے بڑھیے تو ان حقائق کے نیچے وہ احوال ومقامات مزید برآں ہوتے ہیں جو دلوں میں ان حقائق کے اترنے ہی سے دلوں پر طاری ہوتے ہیں، جن سے مخاطب کے قلب کو رنگنا اور باکیف بنانا منظور ہوتا ہے، جیسے محبت وانس، ذوق وشوق، رجا وخوف، مقصدِ حق کی لگن اور اس میں عزیمت اور اس کے مقابلے میں غیر حق سے گریز اور اس سے فرار اور بچاؤ اور اس پر غیظ وغضب اور مخاطب کا اس سے اور اس کے مقتضیات سے گریز اور ان کے قرب تک بھی پہنچنے سے خوف ودہشت اور جذبۂ انکار وانحراف وغیرہ، جن سے مخاطب کے قلب کو بھر دینا مقصود ہوتا ہے کہ وہ محض قال کے درجے میں نہ رہیں، بل کہ حال کے درجے میں پہنچ کر طبیعتِ ثانیہ بن جائیں اور روح میں رچ جائیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا کاغذ میں آنا اور کاغذ ہی سے دلوں میں پہنچ جانا بغیر صاحب کلام کی شخصیت، یا اس کے فرستادوں کی تربیت کردہ شخصیات کی تفہیم وتمرین اور تدریب وٹریننگ؛ اور دوسرے لفظوں میں متکلم کے دل کا مخاطب کے دل کو اپنے اوپر ڈھال دینے کی ہمت وسعی، محض کاغذ اور اس کے نقوش سے ناممکن ہے، جب تک کہ صاحبِ کلام بہ ہمتِ باطن مخاطب کو متاثر نہ کرے، اندریں صورت جب کہ ذہن

کلام کی لفظی مراد سے بھی آدمی کی شخصیت کے بغیر آشنا نہیں ہوسکتا، درحالے کہ اس پر دلالت کرنے والے الفاظ تو کم از کم نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو یہ باطنی کیفیات اور لطیف احول و مواجید تو کاغذ کے نقوش کی گرفت میں کیا ہی آسکتے تھے؟ کہ بغیر کسی تربیت یافتہ مربی کی تفہیم و تمرین کے دلوں میں اتر جائیں، اور دل ان سے رنگ پکڑ کر صبغۃ اللہ کے رنگ سے رنگین ہو جائے !!

ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قانونِ حق کی غرض و غایت عمل ہے، جس سے انسانی سعادتوں کا تعلق ہے؛ اور ظاہر ہے کہ قانون کتنا بھی جامع، مانع اور غایتِ بلاغت سے اپنے معانی پر حاوی ہو، اس کے الفاظ و نقوش اور حروف تو بجائے خود ہیں، متکلم کے زورِ تکلم سے بھی عمل کی مطلوبہ ہیئت مشخص نہیں ہوسکتی، جب تک کہ عمل کر کے دکھلانے والا اس ہیئت کو اپنے عمل سے نمایاں کر کے نہ دکھلائے؛ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے مثلاً صرف نماز کا یہ الٰہی حکم ہی نہیں سنا دیا کہ صلّوا (لوگو! نماز پڑھو یعنی جس طرح تمہارا دل چاہے) بل کہ اسوۂ حسنہ کی ہیئتِ مطلوبہ قائم کرنے کے لیے یہ فرمایا "صلوا کما رأیتمونی أصلی" (۱) نماز ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے ہوئے دیکھو۔

جس سے واضح ہے کہ نماز کے مفہوم کے ساتھ اس کی ہیئت کذائی بھی وہی مطلوب ہے جو مرادِ خداوندی ہے، اور اسے خدائی فرستادہ ہی عملاً کر کے دکھلا سکتا ہے، محض کاغذ یا تلفظ نمایاں نہیں کرسکتا؛ یہی وجہ ہے کہ قرآنی امر کے بعد خود حضور ﷺ کو بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نمازیں پڑھ کر دکھلائیں اور اپنے عمل سے اوقات کی تعیین سمجھائی۔

---

(۱) بخاری کتاب الآذان، باب الآذان للمسافرین، رقم ٦٣١

منزل من اللہ قانون کے لیے مبعوث من اللہ شخصیتیں

ظاہر ہے کہ اگر کوئی ناواقف یا برخود غلط آدمی قانون آنے کے بعد اس کی مربی شخصیت سے کٹ کر محض کاغذ، محض لٹریچر اور اس کے کالے نقوش ہی کا قیدی بن کر رہ جائے، جن میں نہ مرادفہمی کا لب ولہجہ ہے، نہ کلامی حرکات وسکنات اور طرزِ ادا کا کوئی نقش ثبت ہے، نہ عمل کی ہیئتِ کذائی مرتسم ہے، نہ اس کی کوئی باطنی کیفیت منقش ہے، نہ قلبی حرارت اور وجدانِ سلیم کے رجحانات کی کوئی چھاپ لگی ہوئی ہے، تو مطالعہ کنندہ اس کلام سے وہی کچھ سمجھے گا جس کی کیفیت خود اس کے نفس پر غالب ہوگی، جو یقیناً مرادِ خداوندی نہ ہوگی، بل کہ وہ خود اسی کی اپنی مراد ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ علاوہ غلط فہمی اور غلط روی کے، غلط اندازی بھی ہوگی، جس کا نام ''تلبیس'' ہے کہ لفظ خدا کے لیے جائیں اور مرادات اپنے نفس کی باور کرائی جائیں؛ اس لیے ناگزیر تھا کہ منزل من اللہ قانون کے ساتھ مبعوث من اللہ شخصیتیں بھی آئیں، اور پھر ان کے بعد کے قرون میں بھی ان سے تربیت پاکر ذواتِ قدسیہ تسلسل کے ساتھ آتی رہیں، جو کلام کو سنائیں، سمجھائیں، مرادات بتلائیں، نمونۂ عمل دکھلائیں اور اپنی تمرین وتربیت سے مخاطبین کے قلوب کو زیغ سے پاک کر کے استقامت، فہم وعقل اور کیفیات درونی کے نقطے پر جما کر، حقیقی مراد کے سمجھنے اور اس کے عمل کی لگن لگ جانے اور اس کی اندرونی کیفیات سے باکیف ہونے کے قابل بنائیں؛ اس لیے کتاب کے ساتھ معلم ومربی کی شخصیت لازم ملزوم رکھی گئی، تاکہ ان کی صحبت ومعیت اور ان کی تمرین وٹریننگ سے یہ مراحل تکمیل پائیں؛ ورنہ کتب سماوی کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی ضرورت ہی نہ تھی۔

کتاب اور صاحبِ کتاب کی حیثیت

پس کتاب تذکیر کے لیے ہوتی ہے ﴿ولقد یسرنا القرآن للذکر﴾ (القمر) اور شخصیت تبیین (معانی کھولنے) کے لیے ہوتی ہے ﴿لتبین للناس﴾ تا کہ الفاظِ کتاب کا اصلی اور حقیقی مقصد اور مقصد کے نیچے چھپے ہوئے حقائق و کوائف، قلب کے سامنے آجائیں، اس لیے حق تعالیٰ نے نزولِ ذکر (قرآن) کے بعد اولین درجہ تبیینِ معانی یعنی بیان مراد کو دیا ہے، ارشاد ہے:

وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون (النحل ٤٤)	اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کو وہ کتاب واضح کر کے سمجھا دیں جو ان کے پاس بھیجی گئی ہے تا کہ وہ بھی غور و فکر کریں۔

غور و فکر کا دائرہ

یہاں قابل توجہ یہ نکتہ ہے کہ آیت کریمہ میں لتبین للناس کو لعلهم يتفكرون سے مقدم لایا گیا، جو ذاتِ نبوی ﷺ کی شخصیت مقدسہ سے متعلق ہے، اور اس میں فکر و غور کرنے کو مؤخر رکھا گیا، جس کا حاصل یہی ہے کہ فہم و مراد یا تبیّن مراد پہلے ہے جو شخصیت سے متعلق ہے، اور غور و فکر بعد میں ہے جو عقل و خرد سے متعلق ہے؛ جس کا حاصل یہ ہے کہ غور و فکر مراد کے دائرے میں رہ کر کیا جائے، تا کہ مراد ربانی کے حقائق کھلیں، نہ یہ کہ خود مراد کو اپنے غور و فکر سے متعین کیا جائے، بل کہ شخصیت کے بیان سے متعین کیا جائے، ورنہ وہ اپنی مراد ہوگی، نہ کہ خدا کی مراد۔

پس نص کی مراد تو سماعی رکھی گئی ہے، جسے بیانِ رسالت کے سپرد کیا گیا، نہ کہ قیاسی کہ عقل و فکر اس میں امام بن جائے؛ البتہ مراد کے اندر رہ کر غور فکر، عقل و خرد کو سونپا گیا، تا کہ مرادی معنی کے حقائق سامنے آئیں، مگر ساتھ ہی عقل کی تربیت بھی شخصیاتِ مقدسہ ہی کو سونپی گئی، ورنہ عقل کی ٹھوکریں حس کی ٹھوکروں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں، جس کا حال فلسفیوں کی تضاد بیانیوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

حکمت اور فلسفے کا فرق

اس سے صاف روشن ہو جاتا ہے کہ مراد خداوندی کی گہری حقیقتوں ہی کا نام "حکمت" ہے اور من مانی مرادات سے نکات کا بیان کورا فلسفہ ہے، جس کا حکمت سے کوئی تعلق نہیں۔

عالم کے مستند ہونے کا معیار

یہی وجہ ہے کہ کسی عالم کے اعلیٰ، ادنیٰ یا متوسط الحال ہونے کا معیار کتاب کی عمدگی اور خوشنمائی کو قرار نہیں دیا گیا، کہ اگر اس کی کتابت اعلیٰ، کاغذ دبیز اور تقطیع موزوں ہو، تو اس سے پڑھا ہوا عالم بڑا عالم سمجھا جائے گا، اور کتاب گھٹیا درجے کی ہے، تو اس سے پڑھا ہوا عالم بھی گھٹیا ہوگا، بل کہ عالم کا ادنیٰ اعلیٰ ہونا، شخصیتوں کے استناد اور ان کی تعلیم و تربیت کے معیار سے سمجھا جاتا ہے، کہ اس کے شیوخ کون ہیں؟ ان کی سند کیا ہے؟ ان کے علم و خشیت کا کیا مقام ہے؟ اور ان کی سند اور روایت یا اجازت کا تسلسل نبی کریم ﷺ تک پہنچا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر سند کا سلسلہ ہی سرے سے نہ ہو یا درمیان سے منقطع ہو، تو وہ عالم خود ساختہ اور محض نوشت و خواند یا قوتِ مطالعہ کا عالم سمجھا جائے گا، اور اس کے غیر مستند اور غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے اسے عالم کہنا بھی

"برعکس نام نہند" کا مصداق ہوگا، اس لیے اس کا قول وفعل دینی امور میں نہ حجت ہوگا، نہ قابل التفات، اس لیے عالم کو جانچنے کے لیے سب سے پہلے اس کی سند دیکھی جاتی ہے، جس سے اس کے شیوخ اور مربیوں کے سلسلے کا پتہ چلے، نہ کہ خواندہ کتابوں کے نام، یا ان کی کتابت وطباعت کی خوبی اور عمدگی سے اسے جانچا جاتا ہے؛ اگر کتابوں کا ذکر بھی آتا ہے تو بذیلِ سند واستناد ہی آتا ہے، بالاستقلال نہیں آتا؛ ورنہ آج کے دور میں ترجمے دیکھ کر، یا ادب ولغت کے بل بوتے پر، یا قوتِ مطالعہ اور ذاتی ذہانت و طباعی کے سہاروں پر، بہت سے مدعیانِ علم نظر آتے ہیں، جن کے اردگرد بہت سے ناواقف اور پڑھے لکھے ان پڑھوں کا جمگھٹا بھی لگا ہوتا ہے؛ لیکن سندِ متصل اور متوارث تربیت سے منقطع ہونے کے سبب حقیقتاً وہ علمی وراثت سے کورے ہوتے ہیں اس لیے ان کا اور ان سے مستفید حلقے کا علم، اس کی صحتِ فہم یا مراد فہمی اور ہدایت یافتگی معلوم؛ اس لیے نبی کریم ﷺ نے دنیا سے علم کے اٹھ جانے کو علمائے حق کے اٹھ جانے کا نتیجہ بتلایا ہے، نہ کہ کتابوں کے گم ہو جانے کا۔ عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت سے ارشادِ نبوی ہے:

"إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد، ولكن يقبض بقبض العلماء، حتى إذا لم يبق عالما اتخذ الناس رؤسا جهالا، فافتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا" (مشكوة) (١)

اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائیں گے، کہ بندوں کے دلوں سے علم کھینچ لیں، لیکن علم کو اٹھائیں گے علماء کے اٹھا لینے سے، تا آں کہ جب کسی عالم کو باقی نہیں رکھیں گے، تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے، اور یہ جہلاء لاعلمی سے فتوی دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

---

(١) بخاری، باب كيف يقبض العلم، كتاب العلم، رقم ١٠٠، ومسلم باب رفع العلم، رقم ٢٦٧٣، وترمذی باب ماجاء في ذهاب العلم، رقم ٢٦٥٢

اس سے واضح ہے کہ محض پڑھے لکھے ہونے کا نام علم نہیں، بل کہ سند متصل کے ساتھ مستند علماء سے سیکھنے، اور تربیت پا کر صحیح الذوق ہونے کا نام علم ہے، جس کی حقیقی بنیاد یہ ہے، کہ علم درحقیقت نبوت کی میراث ہے، اور وراثت کا مستحق وہی ہوتا ہے. جس کا روحانی سلسلۂ نسب نبوت سے بلا انقطاع ملا ہوا ہو؛ بالکل اسی طرح جیسے مادی وراثت کا مدار باپ دادا سے نسب ثابت ہونے پر ہے، اگر نسب کا سلسلہ ہی باپ تک نہ پہنچتا ہو تو وہ محروم الوراثت شمار ہوتا ہے؛ ایسے ہی علم نبوی کی وراثت کا مدار بھی استناد اور مسلسل نسبت پر ہے، جسے روحانی نسب کہنا چاہیے، جب کہ خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: " أنا لكم بمنزلة الوالد "(خصائص کبری) (۱) میں تمھارے حق میں بمنزلۂ والد کے ہوں، یعنی حضور ﷺ امت کے روحانی باپ ہیں؛ پس اگر یہ روحانی اور علمی سند اور تعلیمی و تربیتی استناد کا سلسلہ شیوخ سے گزرتا ہوا حضور ﷺ تک نہ پہنچتا ہو، تو آدمی علم نبوت کی حد تک محروم الارث شمار ہوگا، اور اس کا علم، لفظی، خود ساختہ، اور اس کے اپنے تخیلات و جذبات سے پیدا ہوگا، جو دینی امور میں نہ حجت ہوگا، نہ قابل التفات، بل کہ ہدایت کے بجائے اور الٹا ضلالت و گمراہی کا سبب بنے گا:

اے بسا ابلیس آدم روے ہست
تا بہر دستے نباید داد دست

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ علم کی گمشدگی کا سبب کتابوں کی گمشدگی نہیں بل کہ رجال علم کی گمشدگی ہے، اور یہ کہ علم کے درجات، مستند شخصیاتِ علم کے اعلیٰ ادنیٰ ہونے پر مبنی ہیں، نہ کہ کتابوں کے اعلیٰ ادنیٰ ہونے پر؛ اس بنا پر قرآن حکیم نے مسلک

---

(۱) رواه ابوادؤ كتاب الطهارة، باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، بلفظ " إنما أنا لكم بمنزلة الوالد " رقم ۸

حق کے لیے کتابِ الٰہی کے ساتھ شخصیتِ الٰہی کولازم ملزوم قرار دیا، کہ اس اقتران واجتماع کے بغیر، کتاب کی مراد اور مراد کے موافق علم کی ہیئت کا مشخص ہونا اور اس علم وعمل پر ان کے آثارِ خوف وخشیت، رجاوتوقع، امید وبیم، محبتِ حق اور عداوتِ غیر حق کا مرتب ہونا عادتاً ممکن نہ تھا۔

عالم ومعلم کا اٹوٹ رشتہ

اس مرحلے پر یہ دقیقہ بھی ذہن سے اوجھل نہ رہنا چاہیے کہ کتاب اور معلم کتاب کا جمع کیا جانا، صرف علم یا مرادفہمی یا کیفیات واحوال ہی کی حد تک ضروری نہیں ہے، بل کہ اخلاق کی حد تک بھی ضروری ہے، جو علم کا سرچشمہ اور عمل کے لیے بمنزلۂ تخم کے ہوتے ہیں؛ نیز عمل کی کیفیات بھی انہی کا ثمرہ ہوتی ہیں؛ یعنی اگر کتاب کو لے کر مربی شخصیت سے یا شخصیت کو لے کر کتاب سے قطع نظر کرلی جائے، تو علاوہ مرادنافہمی کے اخلاق میں بھی گراوٹ، افراط وتفریط اور بے اعتدالی کا پیدا ہوجانا طبعی ہے؛ جس کی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ علم انسان کی خود اپنی صفت نہیں، بل کہ صفت خداوندی ہے، اس لیے وہ نیچی بن کرنہیں رہ سکتی، بل کہ بذاتِ خود بلند مقام اور رفیع المرتبت ہے، جو کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی پستی وذلت قبول نہیں کرسکتی؛ اس لیے جس شخصیت میں بھی علم الٰہی آئے گا، وہ بھی بہ حیثیت عالم ہونے کے نیچی بن کرنہیں رہ سکے گی۔

شیخ کامل کی ضرورت

اندریں صورت قوی خطرہ تھا کہ علمی رفعتوں کے راستے سے عالم میں ذاتی ترفع وتعلّی اور خود بینی اور خود پسندی کے جذبات ابھر آئیں اور وہ علمی غرور، گھمنڈ اور خود رائی وخود ستائی، کبر ونخوت اور تحقیرِ غیر کے مکروہ جذبات میں مبتلا ہوجائے، جس سے نہ وہ

عالم رہے، کہ علم اس کی اپنی صفت ہی نہ تھی، اور نہ سادہ قسم کا جاہل ہی رہے، کہ علم کی پرچھائیں تو بہر حال اس پر پڑی ہوئی ہے؛ اور اس طرح اس میں نہ علم کی اصلیت ہی قائم ہو جس سے اس کے آثارِ خشیت وتقویٰ نمایاں ہوں، اور نہ بے علمی ہی ہو، کہ اسے اپنی جہالت کے اعتراف میں تأمل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کی تعلیم ہی کیا کارگر ہو سکتی ہے! اور ہو گی بھی تو یہی باطنی نقائص اور کمزوریاں اس کے مستفیدوں میں بھی نمایاں ہوں گی' اس لیے ضروری تھا کہ ایک عالم میں کسر نفسی، سرنگونی اور خاکساری کے جذبات ابھارے جائیں؛ مگر وہ کسی مردِ حق کے سامنے پامال ہوئے بغیر ابھر نہیں سکتے تھے، اور اس کی صورت اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ اسے معلم و مربی کے سامنے ادب و تعظیم، کمالِ انقیاد و اطاعت اور بھرپور نیاز مندی و انکسار سے جھکنے اور جھکا ہوا رہنے پر مجبور کیا جائے، کہ اس کے بغیر اس کے نفس کا کبر و غرور اور علمی گھمنڈ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا تھا؛ اور سب جانتے ہیں کہ یہ صورت کاغذ کے آگے جھکنے سے پیدا ہونی ممکن نہ تھی، جب کہ کاغذ اور اس کے حروف ونقوش خود ہی اس کے ساختہ پرداختہ تھے، تو وہ اپنے مصنوع کے آگے کیا جھک سکتا تھا! زیادہ سے زیادہ ان کا صرف رسمی ادب ہی ملحوظ رکھ سکتا تھا؛ اس لیے یہ عقدہ بجائے کاغذ کے، مربی و معلم ہی کے آگے جھک جانے اور بکثرت اس کی ملازمت و معیت اور صحبت میں رہنے، نیز اس کے ساتھ ادب وتواضع سے پیش آنے ہی سے حل ہو سکتا تھا۔ اور یہ کبر و تعلّی کی اخلاقی کدورتیں مربی ہی کی تلقین و تربیت اور مشق کنانی سے زائل ہو سکتی تھیں؛ اس لیے مرادفہمی کے علاوہ اس اخلاقی بنیاد پر بھی قرآن حکیم نے علمِ کتاب کے ساتھ معیتِ صادقین کو لازمی قرار دیا؛ اور جہاں یہ امر کیا کہ علم سے تقویٰ وطہارت اور پاکیزگیِ نفس حاصل کرو، وہیں یہ بھی ہدایت کی کہ صادقین کی معیت و صحبت بھی اختیار کرو، ارشاد فرمایا:

يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله و كونوا مع الصادقين/ التوبه ۱۱۰ — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرواور سچوں کے ساتھ رہو۔

اور جہاں سورۂ فاتحہ میں سوالِ ہدایت کی تعلیم فرمائی کہ

اهدنا الصراط المستقيم / الفاتحة ٦ — بتلا دیجیے ہمیں راستہ سیدھا

وہیں اس صراط کو مطلق نہیں چھوڑا کہ جسے تم اپنی عقل سے صراطِ مستقیم سمجھ لو، اسے ہی اختیار کرلو، بل کہ اسے ''الذين أنعمت عليهم '' کی طرف منسوب کر کے یہ قید لگائی کہ وہ صراطِ مستقیم مانگو جو '' منعم علیھم ''یعنی انبیاء وصدیقین اور شہداء وصالحین کا صراطِ مستقیم رہا ہے، جو بلا شبہ ان سے وابستہ ہوئے بغیر ملنا ممکن نہیں:

ملنے والوں سے راہ پیدا کر — اس کے ملنے کی اور صورت کیا

جس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ صراطِ مستقیم کے ساتھ ان مقدس شخصیتوں کو بھی اختیار کرو کہ وہی تمہیں مطلوبہ صراطِ مستقیم پر لا سکتی اور چلا سکتی ہیں!

پس فاتحۃ الکتاب میں سوالِ ہدایت کے ساتھ ہادیانِ راہ کا ذکر کر کے بلا شبہ شخصیتوں کی معیت وملازمت کا سوال بھی دلالتاً بتلایا گیا، جو شخصیاتِ مقدسہ کی تعلیم وتربیت اور معیت کے لازمی ہونے کی کھلی دلیل ہے۔

صحابہ کرام اور صحبتِ نبوی

غور کیا جائے تو یہی معیت وصحبتِ نبوی حضراتِ صحابہ کے ساری امت پر فائق اور افضل وبرتر ہونے کی دلیل ہے؛ کیوں کہ فضیلت اور برتری کی بنیاد یہی صحبتِ نبوی ﷺ اور معیت ذاتِ رسالت ہے۔ صحابی کے معنی ہی صحبت یافتہ ہونے کے ہیں، نہ محض تعلیم یافتہ ہونے کے؛ اس لیے جگہ جگہ ان کی اس معیت ہی کو ان کی عظیم منقبت قرار دیا گیا ہے، جس سے وہ ساری امت پر علی الاطلاق افضل قرار دیے گئے، فرمایا:

محمد رسول الله، والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم الخ / الفتح ٢٩

محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

ایک جگہ تہجد کے سلسلے میں فرمایا ﴿ وطائفة من الذين معك﴾ (مزمل ٢٠)
کہیں منعم علیھم کا ذکر فرماتے ہوئے ان کے اَتباع کے لیے یہی معیت و رفاقت انعام قرار دی گئی، فرمایا:

أولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا (النساء ٦٩)

یہ لوگ (جو اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے ہیں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔

اسلاف میں لفظِ صحبت کا التزام

اسی بنیاد پر سلفِ صالحین میں مستفیدین کو تلمیذ یا شاگرد کے لقب سے یاد نہیں کیا جاتا تھا، بل کہ ''اصحاب'' کے لفظ سے متعارف کرایا جاتا تھا، جیسے: اصحاب ابی حنیفہؒ، اصحاب شافعیؒ، اصحاب عبداللہ ابن مسعودؓ وغیرہ، جو درحقیقت حدیث نبوی کی پیروی ہے، جیسے موٴطا امام مالک میں ہے کہ آپ نے اپنے مستفیدین کو اصحاب ہی کے لقب سے یاد فرمایا ہے، جیسا کہ ''بل أنتم أصحابي ''(۱) کے لفظ سے واضح ہے، اور اس کی تائید اثرِ ابن مسعود سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے ''أولئك أصحاب محمد ﷺ'' فرمایا۔(۲)

---

(١) مؤطا، باب جامع الوضوء ٥٧، ومسلم ٢٤٩، عن أبي هريرة

(٢) رواه رزين عن ابن مسعود كما في المشكاة، رقم ١٩٣، وتمام الحديث: "من كان مستناً فليستن بمن قدمات، فإن الحي لا تؤمن عليه الفتنة، أولئك (بقیہ اگلے صفحے پر)

اتباع اور صحبت کا باہمی ربط

بہرحال، حقیقی معنی میں اتباعِ اسلاف اور ان کے رنگوں میں رنگا جانا، ان کی صحبت ومعیت اور کثرتِ ملازمت کے بغیر ممکن ہی نہ تھا؛ اس لیے جہاں بھی اس مطلوب اتباع کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں سندِ اتباع ان ہی مقدسین کی شخصیات کو قرار دیا گیا ہے، اور ان کے اتباع پر مختلف عنوانوں سے زور دیا گیا۔ کہیں فرمایا گیا:

واتبع سبيل من أناب إليّ (لقمان ۱۵)	اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہوا

کہیں انبیاء علیہم السلام تک کو اصلاحِ خلق اللہ کا حکم دیتے ہوئے یہ حکم ملا کہ مفسدوں کی سبیل اور راہ کا اتباع ہرگز مت اختیار کرو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو کوہِ طور پر چلہ کشی کے لیے جاتے ہوئے یہی ارشاد فرمایا تھا کہ:

وأصلح ولاتتبع سبيل المفسدين (الاعراف ۱٤۲)	اصلاح (خلق) کرنا اور مفسدوں کی راہ کی پیروی مت کرنا۔

ظاہر ہے کہ یہاں معیتِ مفسدین اور ان کے اتباع کی ممانعت میں اتباعِ صالحین کا امر پوشیدہ ہے، جو ان کی معیت وصحبت کے بغیر روبہ کار آنا ممکن نہ تھا، کہیں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو یہ فرما کر کہ ﴿ولاتتبعان سبيل الذين لايعلمون﴾ (یونس ۸۹)

(پچھلے صفحے کا بقیہ) أصحاب محمد ﷺ كانوا أفضل هذه الأمة، أبرها قلوبا، وأعمقها علما، وأقلها تكلفا، اختارهم الله لصحبة نبيه، ولإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم على آثارهم، وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم وسيرهم، فإنهم كانوا على الهدى المستقيم"

رواه رزين كما في المشكاة كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، رقم ۱۹۳، وأخرج ابن عبدالبر نحوه (جامع بيان العلم وفضله ۹۷/۲، دار الكتب العلمية) وأخرجه أبو نعيم في حلية الأولياء (۳۰۵/۱) عن عبدالله بن عمر. وانظر المشكاة بتحقيق الألباني ۶۸/۱

اگر لا یعلمون (جہلاء) کے اتباع سے روکا گیا ہے، تو اس کے معنی "الذین یعلمون" (اہل علم) کے اتباع و پیروی کے حکم کے ہیں؛ کیوں کہ کسی چیز کی ممانعت کے معنی اصولاً اس کی ضد کے امر کے ہوتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صحبت کی اہمیت

یہی وجہ ہے کہ محدثین کے یہاں اصولاً اس راوی کی حدیث زیادہ قابل اعتماد سمجھی گئی ہے جسے لقائے شیوخ کے ساتھ ان کی صحبت و معیت زیادہ حاصل رہی ہو اور زیادہ سے زیادہ ان کی خدمت میں رہ کر انھیں دیکھنے اور نیازمندانہ انداز سے ان کی اطاعت کر کے ان کا رنگ حاصل کرنے کا موقع ملا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس اطاعتِ معلمین اور اتباع مربیان کے بارے میں جو نیازمندی کی خشتِ اول ہے، ایک ہی جملہ ارشاد فرمایا، جس میں مربیانِ نفوس کی ساری اطاعتیں اور ان کے حق میں ساری انکساریاں اور نیازمندیاں جمع فرمادیں:

أنا عبد من علمني حرفا إن شاء باع وإن شاء أعتق (۱)

[میں اس کا غلام ہوں] جس نے ایک حرف بھی مجھے سکھلا دیا، چاہے مجھے بیچ ڈالے، چاہے مجھے آزاد کردے۔

اصلاحِ نفس کے بغیر اصلاحِ خلق کا انجام

بہر حال، قرآنی ہدایات اور قرآن دان شخصیات کے آثار وروایات کے تحت اپنے مافوق اہلِ علم، اہل انابت، اہل صدق وصفا، اہل صراط مستقیم اور اہل انعام کی اطاعت اور ان کی معیت وصحبت اور ملازمت کے بغیر ماتحت عالم میں سے علمی غرور اور ترفع وتعلّی کا مادۂ فاسدہ کا خارج ہونا ممکن نہ تھا، اور وہ متواضع، خاکسار، منکسر المزاج اور فانی بنے بغیر اصلاحِ خلق اللہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا، بل کہ اس کبر وغرور کی بدولت

(۱) دیکھیے تعلیم المتعلم ص: ۲۳ (ادارۂ علم وادب، دیوبند)

مخلوق کے حق میں اور زیادہ فتنہ بن کر رہ جاتا، اس لیے علمِ کتاب کے ساتھ معلمِ کتاب اور مربیِ نفوس کی معیت و ملازمت کی قید لگائی گئی، تاکہ صالح بن کر آدمی صحیح معنی میں مصلحِ بن سکے؛ ورنہ بلا صلاح کے اصلاح، انجامِ کار افساد ہو جاتی ہے۔

صاحبِ ہدایہ نے ایک قطعے میں ایسے ناتربیت یافتہ مصلح (۱) اور غیر اصلاح یافتہ مصلح کے فتنہ ہونے کی تصویر کس قدر بلیغ الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

فساد کبیر عالم متهتك — وأكبر منه جاهل متنسك

هما فتنة فی العالمین کبیرة — لمن بهما فی دینه یتمسك (۲)

ترجمہ: دھڑلے سے گناہ کرنے والا عالم، فساد عظیم ہے، اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر فسادِ عظیم، جاہل عابد ہے، جو جاہلانہ انداز سے عبادت میں لگا ہوا ہو، جس میں شریعت وسنت کی پیروی اور اس کا صحیح ذوق نہ ہو۔ یہ دونوں قسم کے لوگ جہانوں کے حق میں فتنۂ عظیم ہیں؛ جو بھی اپنے دین کے بارے میں ان سے حجت پکڑے گا وہ فساد میں مبتلا ہوگا۔

غیر تربیت یافتہ عالم و مصلح کا فتنہ

اس لیے نبی کریم ﷺ نے امت کے بارے میں عوام سے خوف نہیں کھایا، بل کہ بے نسبت قسم کے خواص سے کھایا اور فرمایا:

وإنما أخاف على أمتي الأئمة المضلين، وإذا وضع السيف في أمتي لم يرفع عنها إلى يوم القيمة (أبو داؤد كتاب الفتن وابن ماجه) (۳)

مجھے اپنی امت کے حق میں گمراہ کن پیشواؤں کا ڈر ہے اور جب میری امت میں تلوار چل پڑے گی تو پھر قیامت تک رکے گی نہیں۔

(۱) کذا، جب کہ یہاں عالم مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اس کو صاحبِ ہدایہ کے شاگرد برہان الدین زرنوجی نے اپنی کتاب تعلیم المتعلم میں نقل کیا ہے، لیکن وہاں کبیرۃ کے بجائے عظیمۃ ہے۔ (دیکھیے ص ۳۲)

(۳) ابو داؤد عن ثوبان كتاب الفتن والملاحم، باب ذكر الفتن ودلائلها، رقم ۴۲۵۲، وابن ماجه كتاب الفتن، باب مايكون من الفتن، رقم ۳۹۵۲

اور وہ دو ہی نوعیں ہیں: ایک عالم بلا سند اور ایک عابدِ جاہل، اس لیے علماء نے انہی دونوں نوعوں سے بچتے رہنے کی ہدایت کی ہے۔ علماء متقدمین کا عام مقولہ تھا کہ:

احذروا من الناس صنفين، عالم قد فتنته هواه و عابد قدأعمته دنياه (۱)

دو قسم کے لوگوں سے بچو: ایک اس عالم سے جس کو اس کی ہوائے نفسانی نے فتنے میں ڈال رکھا ہو (کہ جو کچھ سمجھتا یا کہتا ہو وہ ہوائے نفس اور ذاتی مقصد ہی سے کہتا ہو) اور ایک اس عابد اور درویش سے جسے اس کی دنیا طلبی نے اندھا کر رکھا ہو (اور اس کی بات بات میں دنیا طلبی چھپی ہوئی ہو)

اس سے صاف واضح ہے کہ علم کے ساتھ عالم جب تک کسی عالمِ صالح اور مربی سے جڑ کر اپنی علمی اور اخلاقی حالت کو مستقیم نہ بنائے، بل کہ معلم کی دار و گیر اور احتساب کے شکنجے میں نہ کسا جائے، وہ مستند عالم یا مصلح کہلائے جانے کا مستحق نہیں؛ اگرچہ ایک بھیڑ کی بھیڑ اسے عالم کہتی ہو اور اس کے پیچھے لگی ہوئی ہو ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا
عیسی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

تزکیۂ نفوس کاغذی نقوش کے ذریعے ممکن نہیں

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفوس کاغذ اور اس کے نقوش سے نہیں ہوتی، بل کہ کاغذ کے تحت مربی شخصیت کی معیت اور صحبت اور اطاعت صرف علم اور مراد فہمی ہی کی حد تک ضروری نہیں، بل کہ تصحیحِ اخلاق کے لیے بھی ناگزیر ہے، جس کی صحت پر خود علم کی صحت کا مدار ہے، مگر اس میں پھر بھی ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ ان مربی شخصیات کی عقیدت و محبت، عظمت و تقدیس اور ان کے سامنے ہمہ

(۱) اس کو حضرت قاری صاحب نے علامہ ابن تیمیہؒ کے حوالے سے آگے دوسرے موقع پر بھی نقل کیا ہے، دیکھیے ص ۵۶

سرنگونی ونیازمندی اوراتباع وپیروی سے ایک تابع میں اپنے متبوع کی نسبت سے کہیں ذلتِ نفس اورغایتِ تذلل کا جذبہ نہ ابھرآئے، اورشخصیت پرستی کے رذائل اس میں پیدا نہ ہوجائیں، اوروہ مربی کودین میں آمر مطلق نہ سمجھ بیٹھے یعنی رب نہ بنالے، کہ یہی راہ بدعات ومنکرات کے نشوونما کی راہ ہے جس سے انجام کارنفس میں شرک کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اورمربی کورب بنالینے کی سوجھتی ہے۔

شخصیات کی اندھادھند پیروی کا نتیجہ

ظاہر ہے کہ ایسا متذلل عالم جومخلوق کی بندگی کا خوگرہو، متکبر عالم سے بھی زیادہ خطرناک اوراصلاحِ خلق کے بجائے افسادِ خلق کا ذریعہ بن جاتا ہے، جن میں گروہی تعصب، حمیتِ جاہلیت، جھگڑالوپن اورفرقہ بندی کی ہوا بھرجاتی ہے، شخصیات کے ذاتی اقوال وافعال کی اندھادھند پیروی سے بدعت پسندی اوراس سے شرک انگیزی اوراس سے توحید بیزاری کی خُوے بدراسخ ہوجاتی ہے، جس کا خاصۂ لازمہ نزاع و جدال، فتنہ وفسادانگیزی، مسلمانوں کو باہم لڑاکر پارٹی فیلنگ سے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالنا اوراہل حق کے مقابل ہوکران سے نفرتیں کرنا اورچیلنج بازی کرتے رہنا ہے، جوبدعت اورشرک کا طبعی خاصہ ہے، جیسا کہ حدیثِ نبویؐ میں اس کی صراحت فرمائی گئی ہے۔

علم کتاب کی ضرورت

اس لیے شخصیاتِ مقدسہ کی تعظیم وپیروی کے ساتھ علم کتاب بھی لازم رکھا گیا، تاکہ علم کی روشنی میں حدودشناسی سے تعظیم وعبادت یااس تربیت وربوبیت میں امتیاز اوراطاعت وعبدیت کا فرق پیش نظر رہے، تاکہ مربی کورب کے درجے میں پہنچا دینے کی جرأت نہ ہو، جیسا کہ یہودونصاریٰ نے اس فرق کونظرانداز کرکے شخصیاتِ مقدسہ کوسامنے رکھ کرخدااوربندے کا فرق اٹھادیا، بعض نے غایت جہالت سے خدا

میں بندوں کی ناقص صفات مان لیں جو توہینِ رب کی انتہا ہے، اور بعض نے غایتِ عقیدت سے خدا کی صفاتِ خاصہ بندوں میں تسلیم کرلیں جو تعظیم عبد کی انتہا ہے، بعض مخلوق کے پجاری بن گئے اور بعض خالق کی پوجا سے بھی کٹ گئے۔

معتدل مسلک و مذہب کی بنیاد

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کتاب کے ساتھ مقدس شخصیات کی تعلیم تفہیم، تربیت و تمرین اور صحبت و معیت نہ ہو، اور جب تک اس صحبت و معیت کے ساتھ کتاب اللہ کا علم و معرفت اور اس سے حدود شناسی کا شعور نہ ہو، کسی معتدل مسلک و مذہب کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوسکتی، چہ جائے کہ ایسا مسلک آگے بڑھے اور قلوب میں سلامت روی یا اعتدال پیدا کرسکے، اس لیے اس دونوعی یکجائی کی حکیمانہ تعلیم کے ذریعے اگر ایک طرف اطاعتِ شخصیات سے تکبر کا ازالہ کیا گیا ہے، تو دوسری طرف علم کتاب اور حدود شناسی سے تذلل اور مخلوق پرستی کا استیصال کیا گیا ہے، کہ ان دونوں جہتوں کی اس افراط وتفریط کے خاتمے ہی پر اعتدال کا مقام آتا ہے۔ جس پر مسلکِ حق کی تعمیر کھڑی ہوسکتی تھی۔

ہدایت کے دو عنصر

بنابریں قرآنِ حکیم نے ہدایت کے سلسلے میں ان دونوں عنصروں (کتاب وشخصیت) کے جمع رکھے جانے کو جو عدل واعتدال کی اساس ہے، بطور ایک کلی ضابطہ اور قانونِ عام کے اقوام وامم کے سامنے رکھا، جس کی غرض وغایت ہی مخلوق میں قیام عدل وقسط ظاہر فرمائی، فرمایا:

لقد أرسلنا رسلنا بالبینٰت وأنزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط / الحدید ۲۵	ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں

غور کیا جائے تو اس آیت میں سابقہ آیت کی طرح ارسال رسل کو انزال کتب پر مقدم لاکر شخصیت کی ضرورت کو کتاب سے بھی زیادہ اہم قرار دیا ہے، جب کہ کتاب کا نزول ہی شخصیت پر ہوتا ہے، نیز کتاب اللہ کا کتاب اللہ باور کرانا اور اس کے الفاظ و تعبیرات کا پہنچانا، پھر اس کی مرادات کا سمجھانا اور لوگوں کے دل و دماغ کو زیغ اور کجی سے پاک کر کے صحیح صحیح مرادات سمجھنے کے قابل بنانا شخصیات ہی سے متعلق تھا نہ کہ محض کاغذی نوشتوں سے، اس لیے کتاب پر شخصیت مقدسہ کو مقدم رکھ کر ان کی اہمیت اور اقدمیت پر روشنی ڈال دی گئی؛ لیکن اس کے معنی کتاب کی عدم اہمیت کے نہ سمجھ لیے جائیں، معاذ اللہ! بل کہ یہ ہیں کہ کتاب اللہ کا ظہور شخصیت پر موقوف ہے، نہ یہ کہ کتاب اہم نہیں، ورنہ انزال کتب کا ذکر ہی نہ کیا جاتا؛ پس انزال کتب نہ صرف اہم ہی ہے بل کہ اس لیے لابدی اور ضروری بھی ہے کہ تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس وغیرہ کے قوانین وضوابط اور احکام وہدایات تو بہر حال کتاب ہی کے ذریعے سامنے آسکتے تھے، پس حسبِ معروضۂ سابقہ کتاب مذکر ہے اور شخصیت مبیِّن ہے، اور سلسلۂ ہدایت وارشاد اور راہِ تعلیم وتربیت کے لیے دونوں ہی عنصر ناگزیر ہیں۔

بہر حال، ہدایت کے یہ دونوں ہی عنصر (کتاب وشخصیت) فرق مراتب کے ساتھ بہ نصِ قرآنی ضروری اور لازمی قرار دیئے گئے؛ اگر کتاب نہ آئے تو قانون کا وجود ہی نہیں ہوتا، اور شخصیات نہ آئیں تو قانون کی مرادات ومقاصد کا وجود نہیں ہوتا جو روحِ قانون ہے، جس کے بغیر قانون کا وجود وعدم برابر ہے، ایک صورت میں قانون نہیں رہتا اور ایک صورت میں روحِ قانون نہیں رہتی کہ وہ زندہ قانون کہلائے، دونوں کا حاصل یہ ہے کہ قانون نہیں رہتا اور مخلوق لاقانونیت کا شکار ہو کر رہ جاتی، جو خدا کی رحمتِ واسعہ اور لطف وکرم سے بعید ہے؛ اس لیے اس نے اپنے کلام مبارک میں ان دونوں عنصروں کے عطا کرنے کی اطلاع دہی کے ساتھ انھیں قانوناً جمع فرما کر جمع

رکھنے کی ہدایت بھی فرمائی اور اپنے اعجازی اسلوبِ بیان سے ان کے باہمی فرقِ مراتب پر بھی روشنی ڈال دی۔

وذلك فضل الله والله ذو الفضل العظیم

یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جو ان دونوں عناصرِ ہدایت سے خالی چھوڑ دیا گیا ہو، کہ نہ خدا کی طرف سے کوئی قانون آیا ہو، نہ مربی شخصیت، یا کتاب آگئی ہو اور معلمِ کتاب شخصیت ساتھ نہ آئی ہو، یا اس کے برعکس شخصیت آگئی ہو اور قانون اس کے ساتھ نہ ہو، ابتدائے عالمِ بشریت میں اگر صحفِ آدم آئے تو آدم بھی ساتھ آئے اور مابعد کے قرون میں مثلاً اگر صحفِ ابراہیم آئے تو ابراہیم بھی ساتھ آئے، تورات آئی تو موسیٰ بھی آئے، زبور وانجیل آئی تو داؤد و مسیح بھی ساتھ آئے، اور دنیا کے آخری دور میں اگر خاتم الکتب (قرآن) آیا تو خاتم الرسل بھی ساتھ آئے۔ صلوٰت الله و سلامه علیهم أجمعین۔

دین کے چار بنیادی شعبے

چناں چہ جس آیت قرآنی میں اس آخری اور مکمل دین کی اطلاع دی گئی، اسی میں اس دین سے ہدایت پانے کے ان ہی دو عنصروں کے جمع کرنے اور جمع رکھے جانے کی بشارت اور ہدایت بھی دی گئی، جسے حق تعالیٰ نے اپنا احسان ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

لقد من الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولا من أنفسهم يتلوا عليهم آياته و يزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين (آل عمران ١٦٤)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا، جب ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کی صفائی کرتے ہیں اور ان کو کتاب و دانشمندی کی باتیں بتلاتے ہیں اگر چہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس میں ''رسولا من أنفسهم '' کے کلمے سے تو مربی ذات بتلائی گئی اور ''یتلوا علیهم '' سے آخر تک وظائف نبوی کی صورت سے قانونِ دین اور اس کے اساسی شعبے سمجھائے گئے ہیں جن کا خلاصہ چار نمبروں میں حسب ذیل ہے:

۱- ایک تلاوت آیات، تا کہ قانونِ الٰہی کی وہی تعبیرات سامنے آئیں جو خود حق تعالیٰ ہی نے وضع فرمائیں جن میں اس کے ہدایتی مقاصد منطوی اور مندمج تھے۔

۲- دوسرے تعلیم مرادات، تا کہ الفاظِ قانون سے وہی مقاصد وحقائق ذہن نشین ہوں جن کا حق تعالیٰ نے قصد فرمایا۔

۳- تیسرے نمونۂ عملیات (حکمت عملی یا اسوۂ حسنہ) تا کہ امت کا عمل اسی نمونے کے مطابق ہو جو نبی کی ذات نے کر کے دکھلایا۔

۴- چوتھے تزکیۂ نفسیات، جس سے نفس کا زیغ اور کجی دور ہو کر مرادفہمی کی صحیح صلاحیت پیدا ہو جائے اور آدمی سلامتیِ فہم سے ٹھیک اسی مراد کے سمجھنے کے قابل بن جائے جو مقصدِ خداوندی ہے اور اس تربیت ربّی سے جذبۂ عملی کے ساتھ باطنی احوال وکیفیات اور ان کو اپنے درجے میں رکھنے کی استعداد مہیا ہو جائے۔

عناصرِ ہدایت کا عقلی تجزیہ

آیتِ بالا کی روشنی میں ان ہر دو عناصرِ ہدایت (قانون اور مربی شخصیت) کے نقطۂ نظر سے عقلاً چار ہی موقف نمایاں ہو سکتے ہیں:

۱- ایک یہ کہ ان دونوں عنصروں کو جذبۂ ایمانی سے مانا جائے۔

۲- دوسرے یہ کہ دونوں سے انحراف کیا جائے۔

۳- تیسرے یہ کہ قانون کے الفاظ لے کر مربی شخصیات سے انقطاع کر لیا جائے۔

۴۔ چوتھے یہ کہ شخصیتوں کو لے کر قانون سے یکسوئی اختیار کر لی جائے۔

پہلی صورت اہل حق کی ہے، جنھوں نے قانونِ الٰہی اور ذاتِ بابرکاتِ نبوی کو سر آنکھوں پر رکھ کر اپنے طبعی جذبات یا عقلی نظریات یا کورانہ تقلیدِ آبائی یا قانون کے محض لغوی مفہومات کو مشعل راہ بنانے کے بجائے اس راہ کو اپنایا جسے قرآن حکیم نے قانون اور شخصیت کے مجموعے سے مقید کر کے پیش کیا، اس طرح یہ حقانی طبقہ اس احسان وانعام کا مورد بن گیا جسے قرآن نے اس آیت میں ﴿ لقد من الله ﴾ سے تعبیر کیا ہے جس میں صحابۂ کرام سے لے کر بعد کے وہ تمام اہل حق داخل ہیں جو اس راہ پر چلے اور دنیا کو چلایا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی اس منصوص اور مرکب راہ کے سوا ہدایت طلبی کے بقیہ تین خود تراشیدہ راستے کہ یا قانون و شخصیت دونوں سے انحراف ہو یا ان میں سے کسی ایک سے انحراف ہو، تو ظاہر ہے کہ وہ اسی لقب کے مستحق ہوں گے جسے قرآن حکیم نے اس آیت میں ﴿ لفی ضلال مبین ﴾ سے تعبیر فرمایا ہے۔

تاریخ عالم سے استدلال

اس اصول کی روشنی میں اگر اقوام دنیا کی تاریخ میں نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ دنیا میں جب بھی کوئی قوم گمراہ ہوئی، تو یا ان دونوں عناصر سے انحراف کی وجہ سے یا ان میں سے کسی ایک سے کٹ کر اور دوسرے کو لے کر ہی گمراہ ہوئی ہے۔

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم

جیسا کہ قرآن حکیم میں اقوام سابقہ کے تذکروں میں جگہ جگہ اسے واضح کر دیا ہے، مثلاً سب سے پہلی قوم جس نے دنیا میں شرک اور کفر کی بنیاد ڈالی، قومِ نوح ہے؛ اور سب سے پہلے پیغمبر جنھیں کفر و شرک کا مقابلہ کرنے کے لیے مبعوث فرمایا گیا، نوح

علیہ السلام ہیں؛ دعوتِ نوحی پر قوم کے برسر اقتدار طبقہ نے ذاتِ بابرکات نوحی کو تو یہ کہہ کر رد کیا کہ تم میں ہم سے زیادہ کون سی بڑائی اور فضیلت ہے کہ ہم تمھارے سامنے جھکیں، بالخصوص جب کہ تمھارے متبع بھی یہ گرے پڑے اور رذیل قسم کے بے وقعت لوگ ہیں، تو ہم اس رذیل جماعت کے ممبر کیسے بن جائیں۔

ما نرك إلا بشرا مثلنا — تمھیں اپنے جیسے ایک فردِ بشر سے زیادہ نہیں دیکھتے۔

اور ومانری لکم علینا من فضل — اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت اور بڑائی کچھ نہیں دیکھتے۔

اور وما نراك اتبعك إلا الذين هم أراذلنا بادى الرأى (هود ۲۷) (۱) — اور ہم سوائے اس کے کچھ نہیں دیکھتے کہ تمھارے متبع وہی ہیں جو ہم میں بالکل رذیل ہیں، اور وہ بھی سرسری رائے سے تمھارے ساتھ لگ گئے ہیں۔

ادھر نوح کی تکذیب کر کے ان کے آوردہ قانون کو جھوٹا بتلایا ﴿ بل نظنکم کاذبین ﴾ اور ان کے کلام حق کے سننے تک کے روادار نہ ہوئے، کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے کہ نوحؑ کی آواز بھی کانوں میں نہ پڑے، منہ پر نقاب ڈال لیتے تھے کہ نوحؑ کی صورت پر بھی نظر نہ پڑے۔

غرض راہِ ہدایت کے ان دو عنصروں ذات اور قانون میں سے کسی کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو انجام کار ہمہ گیر طوفان کے عذاب سے یہ قوم تباہ کر دی گئی۔

قوم عاد کا معاملہ

یہی صورت قوم عاد کی بھی تھی، کہ اس کے اونچے طبقے نے جس کے تابع پوری قوم تھی، شخصیتِ مقدسہ (حضرت ہود علیہ السلام) کو تو یہ کہہ کر ماننے سے انکار

(۱) پوری آیت اس طرح ہے: مانراك إلا بشرا مثلنا ، وما نراك اتبعك إلا الذين هم أراذلنا بادى الرأى وما نرى لكم علينا من فضل ، بل نظنكم كاذبين ۔

کردیا کہ شاید آپ کو ہمارے ان (سنگین) معبودوں نے کسی دماغی خلل میں مبتلا کردیا ہے جو آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں:

إن نقول إلا اعتراك بعض آلهتنا بسوء / هود ٥٤ — ہم صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ تم پر ہمارے کسی معبود کی مار پڑ گئی ہے۔

اورقانونِ الٰہی کے بارے میں کہا کہ ہم قطعاً اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔

وما نحن لك بمؤمنين / هود ٥٤ — اور ہم تمہاری بات کا یقین کرنے والے نہیں

آخرکار، یہ قوم ہوائی طوفان سے تباہ کردی گئی۔

قوم ثمود کی ہٹ دھرمی

یہی صورت قوم ثمود کی بھی تھی، کہ قانونِ حق کے بارے میں تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے رد کردیا کہ یہ تو مشکوک ومشتبہ ہے:

وإننا لفي شك مما تدعونا إليه مريب / هود ٦٢ — اور بے شک ہم خلجان میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں اس دین کے بارے میں جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو۔

اور ذاتِ اقدس کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ اب تک تو آپ ہم میں ایک ہونہار شخصیت تھے، لیکن جب آپ ہمارے آبائی (سنگین) معبودوں سے ہی ہمیں جدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ بھی مشکوک ہیں؛ غرض یقین لاکر نہ دیا، آخرکار، جبرئیل علیہ السلام کی ایک ہی گرج دار ڈانٹ سے اس قوم کے کلیجے پھٹ گئے اور اس کا استیصال کردیا گیا۔

قوم ابراہیم کا منکر طبقہ

اسی طرح قوم ابراہیم کے منکر طبقے نے شخصیت مقدسہ (ابرہیم علیہ السلام) کو تو ظالم کہہ کر رد کیا جو ان کے نزدیک گویا عدل واعتدال سے معاذ اللہ بیگانہ تھے ﴿ إنه لمن

الظلمین ﴾(الأنبیاء ۵۹) اور قانونِ حق کو لھو ولہب اور دل لگی کی باتیں بتلا کر ٹھکرا دیا۔

قالوا أجئتنا بالحق أم أنت من اللاعبین / الأنبیاء ۵۵	کیا تم کوئی سچ بات ہمارے سامنے رکھ رہے ہو یا دل لگی کر رہے ہو۔

قوم شعیب کی صورتِ حال

یہی صورت قوم شعیب کی بھی تھی، کہ اس کے جاہ پرست طبقے نے بھی شخصیت مقدسہ (حضرت شعیب علیہ السلام) کے بارے میں تو انہیں رد کرتے ہوئے یہ کہا کہ

إنا لنراك فینا ضعیفاً / ھود ۹۱

تم ہم میں انتہائی کمزور اور پس ماندہ ہو کہ نہ مال ہے نہ جاہ نہ کوئی اقتدار ہے نہ رسمی شوکت، پھر ہم تمھاری طرف کیوں رجوع کریں!

وما أنت علینا بعزیز / ھود ۹۱

(آپ بڑے کہیں کے عقل مند آئے ہیں) ہماری نظر میں تو تمھاری کوئی وقعت نہیں۔
اور انہیں کاذب بتلایا، جس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:

سوف تعلمون من یأتیه عذاب یخزیه ومن ھو کاذب / ھود ۹۳	جلدی ہی تم اس شخص کو جان لو گے جس پر رسوا کن عذاب آئے گا اور اس کو بھی جو جھوٹا ہے

اور پھر انہیں بستی سے نکال دینے کی دھمکی بھی دی۔

لنخرجنك یشعیب والذین آمنوا معك من قریتنا أو لتعودن فی ملتنا / الأعراف ۸۸	اے شعیب! ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ۔

اور قانونِ الٰہی کے بارے میں کہا کہ:

﴿ما نفقه کثیرا مما تقول / ھود ۹۱﴾ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں تو بکثرت

باتیں تو ہمارے سمجھ ہی میں نہیں آتیں (کہ انھیں آنکھ بند کرکے قبول کرلیا جائے)
اس لیے یہ قوم بھی آخر آگ کے عذاب سے تباہ کردی گئی۔

حضرت موسیٰ اور قوم فرعون

یہی نوعیت دعوتِ موسوی پر فرعون اور قبطی قوم کی بھی تھی کہ انھوں نے ذاتِ اقدس کو تو ﴿إن هذا لساحر﴾ (الأعراف ۱۰۹، الشعراء ٢٤) کہہ کر رد کردیا، ﴿وقالوا ما هذا إلا سحر مفترى﴾ (القصص ٣٦) اور جادوگروں کی بھیڑ بلا کر مقابلہ کرایا، اور فرعون نے تو برملا کہہ ہی دیا کہ:

وإني لأظنه من الكاذبين / قصص ۳۸ میں تو انہیں (موسیٰ) کو جھوٹوں میں سمجھتا ہوں

اور قانون میں آیاتِ بینات کو مکروفریب اور سازش کہہ کر رد کیا:

إن هذا لمكر مكرتموه في المدينة / الأعراف ۱۲۳ بے شک یہ ایک چال ہے جو شہر میں تم چلے ہو۔

تو آخرکار یہ قوم بحر قلزم میں غرقابی کے عذاب سے ہلاک کردی گئی۔

سرکشی کے اسباب

غرض ان اقوام نے ذات اور قانونِ حق دونوں کو برملا رد کیا، جس کی بنیاد بعض میں تو کبر وجاہ اور رعونت تھی: جیسے قارون، ہامان اور خود فرعون؛ چناں چہ ان تینوں کا نام بہ نام ذکر کرکے قرآن نے اس کی وجہ جاہ پرستی اور اقتدار پسندی ہی بتلائی:

﴿وقارون وفرعون وهامان ولقد جاء هم موسىٰ بالبينات فاستكبروا في الأرض وما كانوا سابقين / عنكبوت ٣٩﴾

اور ادھر عامۂ قوم میں آبائی تقلید، جاہلانہ تعصب اور قدیم شخصیت پرستی تھی، وہ اس کی وجہ سے منحرف ہوئی، وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ:

وما سمعنا بهذا فی آباء نا الأولین / القصص ٣٦
یہ تو ہم نے اپنے پہلے آباواجداد سے سنا تک نہیں (جو تم کہہ رہے ہو)

بہر حال، قوم کے برسر اقتدار طبقے نے جاہ پرستی اور اقتدار دوستی سے، اور عوامی طبقے نے جاہلانہ تقلید و تعصب سے، ان دونوں عناصرِ ہدایت کو ماننے سے انکار کر دیا اور عار سے نار کو اختیار کر لیا۔

عناصر ہدایت کے معیار سے امتِ محمدیہ کے طبقات

اسلام کا آوازہ بلند ہونے پر ان ہر دو عناصر ہدایت کے معیار سے اس امت میں بھی ان چار طبقات کا وجود ہوا: ایک طبقے نے تو ان دونوں عناصر ہدایت کو مان لیا، وہ تو صحابۂ کرام ہو کر عالم پر فوقیت لے گئے؛ باقی تین طبقوں میں ایک طبقہ تو مشرکین کا تھا جو امِم سابقہ کی طرح دونوں عناصر ہدایت کا منکر تھا، ان میں منافقین بھی شامل تھے، فرق اتنا تھا کہ مشرکین دل اور زبان دونوں سے ان عناصر ہدایت کا انکار کرتے تھے اور منافقین دل سے منکر تھے، صرف اپنے بچاؤ کی خاطر زبان سے اقرار کرتے تھے؛ ان دونوں فرقوں کے پاس نہ کوئی دستورِ سماوی ہی باقی رہا تھا نہ کوئی مقدس شخصیت ہی رہ گئی تھی جو ان کی تربیت کرتی، جس سے وہ اس گمراہی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ جب ان عناصر ہدایت میں سے ذاتِ بابرکات نبویؐ سامنے آئی تو انہیں شاعر، کاہن، ساحر، کذاب، اشر، مجنون وغیرہ کہہ کر رد کر دیا؛ دوسرا عنصر قانونِ حق (قرآن) سامنے آیا تو اسے اساطیر الاولین اور شاعریت کہہ کہ رد کر دیا۔

غرض نہ ذات کو مانا نہ قانون کو، اس لیے جیسے پہلے بے قانون اور بے شخصیت تھے، ویسے ہی قانونِ الٰہی اور ذاتِ اقدس کے آنے کے بعد بھی رہے اور ہدایت سے یکسر محروم رہ گئے، اور نہ صرف ان عناصر ہدایت سے محروم ہی رہے، بل کہ امم سابقہ کی طرح ان عناصر ہدایت کے استیصال کے لیے بھی ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔

ذاتِ اقدس کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور آپ کے قتل تک کے منصوبے تیار کئے، تا آں کہ آپ نے بہ حکم خداوندی مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو وہاں بھی چین نہ لینے دیا، جنگ کے لیے لشکر چڑھالائے، لڑائیاں لڑیں اور جو کچھ بھی ایذائیں پہنچا سکتے تھے ان سے دریغ نہیں کیا۔ ادھر قانونِ حق (قرآن کریم) کے ساتھ برتاؤ یہ تھا کہ آپ کی آواز کو دبانے کے لیے شور و شغب مچاتے تھے کہ قرآن کا کوئی حرف بھی کانوں میں نہ پڑے، بچوں کو روکتے تھے کہ کہیں قرآن شریف ان میں اثر نہ کر جائے؛ غرض ذات اور قانون دونوں سے کٹ کر ہدایت ہی سے منقطع ہو گئے اور نارِ جہنم کو اختیار کر لیا۔

وعد الله المنافقين والمنافقات والكفار نار جهنم خالدين فيها، هي حسبهم، ولعنهم الله، ولهم عذاب مقيم (التوبہ ٦٨)

اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفر کرنے والوں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ ان کے لیے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیں گے اور ان کو عذاب دائمی ہوگا۔

یہود کی خود پرستی اور اس کے نتائج

دوسرے دو فرقے وہ تھے جو ان عناصر ہدایت میں سے ایک کو لے کر دوسرے سے کٹے ہوئے تھے اور وہ یہود و نصاریٰ تھے۔ یہود کو علمی امت بنایا گیا تھا، انہیں تورات جیسی مقدس اور ﴿تفصيلاً لكل شيء﴾ (الأنعام ١٥٥) کتاب دی گئی تھی، جس سے اپنے وقت میں ان کا علمی رتبہ بڑھا، اور اس دور میں وہ سب سے افضل قرار دیے گئے؛ لیکن بعد چندے، علمی غرور و نخوت کے سبب مربی شخصیات سے علاحدگی پر تل گئے، اور ان کا نظریہ ہی یہ بن گیا کہ جب کتابِ الٰہی ہمارے پاس ہے اور عقل و خرد دماغ میں ہے، تو پھر ہمیں کتاب فہمی کے لیے ان شخصیات کے اتباع و پیروی اور ان کی

ذہنی غلامی کی کیا ضرورت ہے؟ گویا اپنے زعمِ باطل سے اسے تو شخصیت پرستی سمجھا، مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ اس سے بدتر خود پرستی ہے، جس میں وہ مبتلا ہیں! چناں چہ اس خود پرستی اور مربیوں کی تعلیم و تربیت سے محرومی کا پہلا ثمرہ تو یہ نکلا کہ ان میں سے سمع وطاعت کا مادہ نکل کر سمع و معصیت کا رذیلہ پیدا ہو گیا، جس کو قرآن حکیم نے انہی کے الفاظ میں ظاہر فرمادیا کہ:

ویقولون سمعنا وعصینا / نساء ٤٦ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی

اب جب کہ مربیوں کی جگہ ہوائے نفس نے اور طاعت کی جگہ عصیانِ نفس نے لے لی ہے، تو دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کتاب اللہ کا جو بھی حکم ان کے ہوائے نفس کے خلاف ہوا، اس کو انھوں نے رد کر دیا، جسے قرآن حکیم نے ان لفظوں میں واضح فرمادیا کہ:

أفکلما جاء کم رسول بما لا تھوی أنفسکم استکبرتم (بقرة ٨٧) جب بھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ حکم لے کر آیا جسے تمہاری خواہشاتِ نفس پسند نہ کرتی ہوں، تو تم نے استکبار کیا (اسے رد کر دیا)

پھر اسی سے تیسرا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ کتابِ مقدس کے بارے میں اس تربیت یافتہ عقل اور نامہذب نفس کے تخیلات اور ہوا وہوس سے کتاب اللہ کے الفاظ تو سامنے رہ گئے، ان کے معانی وارادات نہ صرف اوجھل ہی ہو گئے، بل کہ ان کی جگہ ان کے نفسانی اختراعات نے لے لی، اور وہی ان کے ذہنوں میں معانیِ کتاب بن گئے، جس سے حق کو تو باطل سمجھ کر رد کر دینے اور باطل کو حق سمجھ کر قبول کر لینے کی خوئے بد پیدا ہو گئی، یعنی فہم ہی الٹ گیا، اور فہم کی جگہ وہم نے اور علم کی جگہ جہل نے لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اپنی آیات کو ان سے پھیر لیا اور انہیں حق سے محروم کر دیا، جیسے قرآن نے فرمایا:

سأصرف عن آياتي الذين يتكبرون في الأرض بغير الحق، وإن يروا كل آية لايؤمنوا بها،وإن يروا سبيل الرشد لايتخذوه سبيلا، وإن يروا سبيل الغي يتخذوه سبيلا / الأعراف ١٤٦

میں ایسے لوگوں کو اپنی آیات سے پھرا ہوا رکھوں گا جو روئے زمین پر ناحق تکبر کرتے رہتے ہیں، اور اگر یہ ساری نشانیاں (بھی) دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا طریقہ نہ بنائیں، اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں۔

چوتھا ثمرہ یہ نکلا کہ جب حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی تو آیاتِ الٰہی کی کھلی تکذیب سے بھی نہ چوکے اور عقل و شعور کی جگہ سفاہت و بدعقلی اور غفلت و تکذیب نے لے لی، جیسے قرآنِ حکیم نے بتلایا کہ:

ذلك بأنهم كذبوا بآياتنا، وكانوا عنها غافلين / الأعراف ١٤٦

یہ (ساری برگشتگی) اس سبب سے ہے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اور ان سے غافل رہے۔

اس پر پانچواں مہلک ثمرہ یہ مرتب ہوا کہ وہ آیاتِ خداوندی کی محض تکذیب ہی تک نہیں رہے، بل کہ ان کی تحریف اور تبدیل پر بھی جری ہو گئے، جس کی قرآنِ حکیم نے خبر دی ہے کہ:

يحرفون الكلم عن مواضعه ونسوا حظا مما ذكروا به / المائده ٨٧

وہ لوگ کلام کو اس کے موقع و محل سے بدل دیتے ہیں، اور جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے ہیں۔

اور پھر آخر کار چھٹا تباہی خیز ثمرہ یہ نکلا کہ انبیاء و رسل کی ذواتِ مقدسہ سے صرف منقطع ہی نہیں ہو گئے، بل کہ ان سے بغض و عداوت ٹھان کر انہیں جھٹلانے مٹانے اور ان کے قتل تک کے مرتکب ہونے سے بھی نہ شرمائے، جس کی اطلاع قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں دی کہ:

ففریقًا کذبتم و فریقًا تقتلون   بعضوں کو تو تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو
(البقرة ۸۷)   تم (بے دھڑک) قتل ہی کرنے لگے۔

بہر حال، کتابِ خداوندی اور قانونِ حق سے یہ اعراض، پھر ہوائے نفسانی سے استکبار، پھر تکذیب، پھر تحریف، پھر صریح انکار، پھر بہ مقابلۂ حق بغض و عداوت اور پھر آخر کار تشدد پسندی اور قتل انبیاء، سب کچھ اسی خود پسندی اور کبر و نخوت کا نتیجہ تھا، جو مربی شخصیات سے کٹ کر، ناتربیتی کی وجہ سے ان میں جڑ پکڑ گیا تھا، جس سے انجام کار ساتواں ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے دلوں میں وہ نرمی و رقت اور لینت ہی باقی نہ رہی جو قبولِ حق، سمع و طاعت اور نیازمندی و خاکساری پر آمادہ کرتی ہے جس کا نام قساوتِ قلبی ہے، قرآنِ حکیم نے اس کے بارے میں فرمایا:

ثم قست قلوبکم من بعد ذلك   پھر اس کے بعد بھی تمھارے دل سخت ہی
فھی کالحجارة أو أشد قسوة   رہے، چناں چہ وہ مثل پتھر کے ہیں، بل کہ
(البقرة ٨٤)   ان سے بھی بڑھ کر سخت۔

بہ نگاہِ عبرت دیکھا جائے، تو یہ سب آثار کتاب اللہ کے اوراق کو چھوڑنے سے تھے، مگر شخصیات مقدسہ سے انقطاع اور ان کی تعلیم و تربیت سے محروم رہ جانے ہی سے ہویدا ہوئے، جو بالآخر دین ہی کو لے ڈوبے اور قوم کی قوم ذلت اور گمراہی کے گھرے غار میں گر کر مغضوب بن گئی، جسے آٹھواں آخری ثمرہ سمجھنا چاہیے جو آخرت تک جا پہنچا، جسے قرآنِ حکیم نے ارشاد فرمایا کہ:

ضربت علیھم الذلة والمسکنة   ان پر جمادی گئی ذلت اور پستی، اور وہ غضبِ
وباؤا بغضب من الله / البقرة ٦١   الٰہی کے مستحق ہو گئے۔

نصاریٰ اور شخصیت پرستی

ادھر نصاریٰ کو عملی امت بنایا گیا تھا اور انہیں انجیل مقدس دی گئی، جس میں فقہی احکام سے زیادہ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفوس کے احکام تھے، تا کہ دلوں کی کلیں درست ہوں اور وہ صحیح معنی میں خدا پرستی، اخلاق درستی اور دلوں کی رقت و نرمی کی راہ پر آئیں۔ ظاہر ہے کہ تربیت کا یہ مرحلہ کاغذ سے طے نہیں ہو سکتا تھا، بل کہ مربی شخصیات ہی کی تمرین و تربیت سے بروئے کار آ سکتا تھا، تو مسیح علیہ السلام کی مقدس اور پاک شخصیت انہیں عطا کی گئی، جس کی طرف وہ متوجہ ہوئے اور حواریوں کی پاکیزہ جماعت پیدا ہو گئی؛ لیکن نسلاً بعد نسلٍ جوں جوں معرفت اور بصیرت گھٹتی گئی اور ادھر تبعی انداز میں بے بصیرتی کے ساتھ مربیوں کی عقیدت و عظمت جوں کی توں وہیں باقی رہی، تو اس میں کورانہ تقلید کے ساتھ غلو پیدا ہو گیا جس سے یہ قوم شخصیت پرستی اور تذللِ نفس کے آخری کنارے سے جا لگی؛ اسے معتدل رکھنے کے لیے علم کتاب اور حدود شناسی کی ضرورت تھی، وہ سامنے نہ رہی، صرف شخصیات اور ان کے اقوال و افعال ہی سامنے رہ گئے، جس سے اس قوم کا نظریہ ہی یہ بن گیا کہ یہ اوراق کی کتاب (تورات و انجیل) تو کتابِ ساکت ہے، اور یہ اہل اللہ کتابِ ناطق ہیں، تو ہم گونگی کتاب کے بجائے اس بولتی چالتی کتاب ہی کو کیوں نہ اپنا ملجا و ماویٰ بنائیں!!

ظاہر ہے کہ جب کتاب اللہ تو سامنے نہ ہو، صرف شخصیتیں ہی سامنے ہوں، جن کے افعال و اقوال ذاتی اور شخصی بھی ہوتے ہیں، ان میں خطا و صواب کا احتمال بھی ہوتا ہے، نیز بعض اوقات غلبۂ حال میں بعض وجدی اقوال و افعال بھی ان سے سرزد ہوتے ہیں، بل کہ بعض اوقات وہ ظواہرِ شریعت پر منطبق بھی نہیں ہوتے، گو وہ ان کے بلند مقامات کا تقاضا ہونے کے سبب بہ لحاظِ حقیقت خلافِ شرع بھی نہ ہوں، مگر

بہر حال وہ شخصی اور ذاتی ہی احوال ہوتے ہیں، قانون عام نہیں ہوتے، کہ ہر کس و ناکس کے لیے پیغام و حکم کے درجے میں آجائیں۔ ساتھ ہی نبی کے بعد غیر نبی اور غیر معصوم کی بشری کمزوریاں بھی ان احوال میں مخلوط ہو سکتی ہیں، جس سے انہیں شریعت یا شرعی حکم نہیں کہا جا سکتا ہے؛ لیکن عوام اور بے بصیرت خواص کے نزدیک شخصیت پرستی اور غلوِ عقیدت و عظمت کے سبب رفتہ رفتہ یہ ذاتی امور بھی رواج پذیر ہو کر عین دین و شریعت بن جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں دینِ خداوندی مخلوقاتی افعال و اقوال کے ساتھ خلط ملط ہو کر رسوم و رواج کا مخلوط مرقع رہ جاتا ہے، اور اس میں کتنی ہی عوامی بدعات اور جاہلانہ خرافات اور کتنے ہی رسوم و رواجات اور محدثات و ایجادات شامل ہو کر خالص دین باقی نہیں رہتا جو بلاشبہ گمراہی ہے۔

یہی وہ گمراہی تھی، جس میں نصاریٰ مبتلا ہوئے اور مبتدع بن کر ضال اور گم راہ قرار پائے، جن کا سارا دین رواجی بن کر رہ گیا۔ قرآنِ حکیم نے ان کی ان ہی رائج کردہ بدعات اور ایجاد کردہ رسوم و رواجات کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ورهبانية ابتدعوها ، ما كتبناها عليهم إلا ابتغاء رضوان الله ، فما رعوها حق رعايتها ، فآتينا الذين آمنوا منهم أجرهم و كثير منهم فاسقون / الحديد ۲۷

اور رہبانیت کو انھوں نے خود ایجاد کیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا بل کہ انھی نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انھوں نے اس کی پوری پوری رعایت نہ کی، سو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے انہیں ان کا اجر دیا اور زیادہ تو ان میں کے نافرمان ہی ہیں۔

اندھا دھند عقیدت و محبت کا انجام شرک ہے

پھر کتاب اللہ سے بیگانگی کے ساتھ شخصیاتِ مقدسہ کی اس غیر محدود عقیدت و محبت سے نصاریٰ محض بدعت تک ہی محدود نہیں رہے، بل کہ ان بدعات کے راستے

سے شرک کی بنیاد بھی پڑ گئی، جو بدعات کا خاصۂ لازمہ اور قدرتی انجام ہے، چناں چہ انھوں نے دین کے بارے میں شخصیاتِ مقدسہ کو حاکمِ مطلق اور آمرِ مطلق بنالیا، ان کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا، نتیجتاً ربِ حقیقی کو تو بھلا بیٹھے، اور ان احبار ورہبان ہی کو رب کا درجہ دے دیا، کہ جو یہ کہہ دیں یا کرلیں وہی واجب الاتباع دین ہے؛ حالاں کہ یہ مقام ربِ قدیر کا تھا نہ کہ مخلوق کا۔ قرآنِ حکیم نے ان کی اس ربوبیتِ غیر اللہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله والمسيح ابن مريم وما أمروا إلا ليعبدوا إلها واحدا (التوبة ۳۱)	انھوں نے اپنے علماء ومشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب ٹھہرالیا اور مریم کے لڑکے مسیح (علیہ السلام) کو (بھی)، حالاں کہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں۔

اور پھر اس غلوِ عقیدت وشیفتگی کے جذبے سے اور آگے بڑھ کر انھوں نے مقدس شخصیات کو خدائی کے درجے تک پہنچا دیا، حضرت مسیح علیہ السلام کو ''ثالث ثلاثة'' کہہ کر شریکِ خدائی ٹھہرا دیا، جس کی قرآنِ کریم نے اطلاع دی کہ:

لقد كفر الذين قالوا إن الله ثالث ثلاثة / المائدة ۷۳	بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انہیں عین خدا تک کہنے سے نہ چوکے، جسے قرآنِ حکیم نے بتلایا ہے کہ:

لقد كفر الذين قالوا إن الله هو المسيح ابن مريم / المائدة ۷۲	بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح ابن مریم ہیں

اور ظاہر ہے کہ جب مسیح اور خالقِ مسیح ایک ٹھہر گئے، تو خواصِ الوہیت کا مسیح میں

مان لینا کچھ بھی مشکل نہ رہا؛ اس لیے نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کے لیے علم غیب کا دعویٰ الگ کیا، احیاءِ موتی کو ان کا ذاتی تصرف الگ بتایا، انہیں نجات دہندہ الگ شمار کیا، اور آخر کار ابن اللہ کہہ کر صاف اعلان کر دیا کہ ایک الٰہ مجرد ہے جو ذاتِ باری ہے، اور ایک الٰہِ مجسّد ہے جو مسیح ابن مریم ہیں۔ یہ تمام نتائج کتاب اللہ سے کٹ کر شخصیاتِ مقدسہ کی غیر محدود عقیدت کے غلو سے ابھرے، اور شخصیات کے بارے میں قوم تذللِ نفس کا شکار ہو کر عملی فتنے کا شکار ہو گئی۔

کتاب اور معلم کتاب میں تفریق کا نتیجہ

بہر حال، ایک امت (یہود) شخصیاتِ مقدسہ سے کٹ کر علمی غرور اور خود نفسی سے تکبر و نخوت اور استکبار و جحود میں اتنی بڑھی کہ پیغمبروں کی تکذیب اور قتل و غارت پر آ کر رکی، اور ایک امت (نصاریٰ) کتاب اللہ سے کٹ کر اور شخصیت پرستی میں مبتلا ہو کر تذللِ نفس اور غلوِ نیازمندی سے اتنی گری کہ پیغمبروں ہی کو نہیں ان کے اتباع اور پیروؤں (احبار و رہبان) تک کو ربوبیت اور حاکمیتِ شریعت کا رتبہ دے دیا، کہ ان کا حلال کیا ہوا حلال اور ان کا حرام کیا ہوا حرام ہے۔

غرض ایک قوم شخصیات سے کٹی تو علمی غرور میں تکبر سے تباہ ہوئی، اور ایک قوم کتابِ خداوندی (قانونِ حق) سے کٹی تو عبدیتِ غیر اللہ کے نشے میں تذلل نفس سے برباد ہوئی؛ ایک میں شبہات کا فتنہ پیدا ہوا اور ایک میں شہوات کا فتنہ ابھرا۔

امت محمدیہ میں امم سابقہ کی مشابہت

ان واقعات و حالات اور آیات و روایات کو سامنے رکھ کر اگر امتِ مرحومہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ان سارے گمراہ طبقوں کی یہ ساری گمراہیاں اور افراط و تفریط کی وہ

تمام صورتیں جو اقوام ماضیہ اور یہود و نصاریٰ میں راہ پاگئی تھیں، اس امت میں بھی رونما ہوئیں، جن کا رونما ہونا یقینی تھا، جب کہ لسانِ نبوت پر اس کی اطلاع دے دی گئی تھی، اور فرمایا گیا تھا:

لتتبعن سنن من قبلكم شبرا بشبر ذراعا بذراع باعا بباع حتى لو دخل أحد جحر ضب لدخلتموه (۱)	تم اپنے سے پہلوں کی ہو بہو پیروی کروگے بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر (یعنی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی بات میں) حتی کہ اگر کوئی (ان میں سے) گوہ کے سوراخ میں گھسا (یعنی عبث اور لغو فعل کیا) تو تم بھی اس میں داخل ہوگے۔

دوسری روایت میں خصوصیت سے یہود و نصاریٰ کی تصریح کر کے اس تشبہ کی اس سے بھی زیادہ بری اور ناپاک ترین صورت ظاہر فرمائی گئی کہ:

ليأتين على أمتي كما أتى على بني إسرائيل حذو النعل بالنعل حتى إن كان منهم من أتى أمه علانية لكان في أمتي من يصنع ذلك (مشكوٰة) (۲)	میری امت پر وہ سب کچھ آکر رہے گا جو بنی اسرائیل پر آیا (بالکل اس طرح) جس طرح جوتا کی ایک پوائی دوسری پوائی پر پوری پوری منطبق ہو جاتی ہے، حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا تو میری امت میں بھی وہ ہوں گے جو یہ حرکت کریں گے۔

اس سچی خبر کے عین مطابق اس مرکب قانونِ ہدایت (کتاب اور معلم کتاب شخصیت) کے معیار سے اس امت میں بھی اقوام ماضیہ کی پوری پوری مطابقت رونما

---

(۱) مسلم، کتاب العلم، باب اتباع سنن اليهود والنصارىٰ، ۲۶۶۹

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة، قال ابوعيسیٰ حديث حسن غريب مفسر لانعرفه مثل هذا إلا من هذا الوجه (أبواب الإيمان، رقم ۲٦٤١)

ہوئی، چناں چہ امت میں وہ طبقہ بھی نمودار ہوا جو ان بنیادوں میں سے کسی ایک پر بھی مطمئن نہ ہوا، اور آج تک بھی اس کی شاخیں پھیل کر پھل پھول لا رہی ہیں، کہ وہ دعوائے اسلام کے باوجود نہ شخصیاتِ مقدسہ کا قائل ہے، نہ قانونِ مقدس کا حقیقی اعتقاد اور اعتماد دل میں لیے ہوئے ہے؛ چناں چہ دین کے قانون اور اصول و فروع کا جہاں تک تعلق ہے، جب وہ اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، تو وہ دبی زبان سے، آج کل کے مروجہ گول مول پیرایوں میں لپٹی ہوئی تعبیرات سے، اور بزعمِ خود بڑے حکیمانہ انداز سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اگلے زمانے گزر چکے ہیں، آج اسلام اپنے قدیم معنی میں دنیا کے لیے کافی نہیں ہو سکتا، بل کہ کافی ترمیم طلب ہو گیا ہے، اس کے فقہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس کا پرسنل لاء آج کے دور میں نہیں چل سکتا، جب تک کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس میں ردوبدل نہ کیا جائے، اور قدیم اسلام کو ماڈرن اسلام کے چولے میں نہ لے آیا جائے۔

ہم رجال ونحن رجال

ظاہر ہے کہ اس کا منشا کوئی سنجیدہ یا معقول حجت تو ہو ہی نہیں سکتی، نہ وہ پیش ہی کر سکتے ہیں، بل کہ اس کی بنیاد یا ان طبقات کے سیاسی مفادات ہیں، یا پارٹیوں کے اقتصادی اور معاشرتی مؤثرات، اور یا پھر کفار کی ہمہ وقتی صحبت و معیت کے اثرات، اور ساتھ ہی قانونِ دین سے کلی جہالت اور ناواقفی ہے۔ اسی طرح جب ان کے سامنے شخصیاتِ مقدسہ کا حوالہ آتا ہے تو وہ اسی بنیاد پر انہیں بھی ”نحن رجال وھم رجال“ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ہم بھی آدمی ہیں جن میں عقل و شعور ہے اور وہ بھی انسان ہی تھے، آخر ان کی یہ غیر معمولی فوقیت کیوں تسلیم کی جائے کہ ان کے اقوال و روایات سے ہمیں مرعوب کیا جائے! بل کہ وہ ان اہل علم کی شخصیات کے بارے میں کھلی رائے یہ

رکھتے ہیں کہ یہ علماء، جو مربیانِ دین کہلاتے ہیں یہی قوم کی ترقی میں حارج اور اس کی پسماندگی اور پس ہمتی کے ذمے دار ہیں، جب تک انہیں راستے سے ہٹا نہ دیا جائے، قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔

روشن خیال طبقے کا نظریہ

ادھر جب کتاب وسنت کا مجموعہ سامنے رکھا جاتا ہے تو بہ ظاہر بڑے ادب سے کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، مگر یہ اس وقت کے غیر متمدن بدویوں کے لیے تو کافی تھا، آج روشنی اور روشن خیالی کا دور ہے، اس لیے مسلمانوں کو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ لکیر کا فقیر بنے رہنے کا دور نہیں؛ بہر حال، نہ وہ قانون پر مطمئن ہیں نہ قانون دان شخصیتوں پر، بل کہ انہیں مقتدا اور مطاع ماننے ہی سے کلیتاً منکر ہیں۔

خوارج اور اس کے ہم خیال فرقے

اسی طرح پھر اس امت میں وہ طبقہ بھی پیدا ہوا، جس نے یہود کی طرح شخصیاتِ مقدسہ سے دامن جھٹک کر بزعم خود صرف کتاب اللہ سے جوڑ لگایا، جس میں پہل خوارج نے کی اور ﴿إن الحكم إلا لله﴾ (یوسف ۴۰ و ۶۷) کا نعرہ لگا کر اپنی مزعومہ روشن خیالی کے تحت کتاب اللہ کے حروف ونقوش کی مرادات کو اپنی عقلِ نارسا اور غیر تربیت یافتہ ذہنی خود رائی سے حل کر لینے کو کافی سمجھ لیا، اور شخصیاتِ مقدسہ اور مربی ذوات سے کٹ گئے، اور نہ صرف ان سے گریز ہی کیا، بل کہ کھل کر ان کے مقابل بھی آگئے، تا آں کہ ان کا موضوع ہی کتاب اللہ کا نام لے کر شخصیاتِ مقدسہ کا استیصال ٹھہر گیا، خواہ زبان وقلم سے ہو یا تلوار سے ﴿ففريقا كذبتم و فريقا تقتلون﴾ (البقرة ۸۷)۔

اس کا طبعی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا کہ ان میں علمی فتنہ پھیلا، وساوس ابھرے اور اس کی سب سے پہلی زد عقائد پر پڑی، جب کہ انھوں نے عقائد کا استفادہ نقلِ صحیح کے بجائے عقلِ سقیم سے کرنا شروع کر دیا، اور وحی خداوندی کو اپنی عقلوں کے تابع بنا لیا حتی کہ متشابہات تک میں عقلی گھوڑے دوڑائے اور ان کے من مانے معنی خود سے متعین کیے، جس سے بہ لحاظ عقائد ان کے نقش قدم پر بعد کے آنے والوں میں بھی عقل خام کی امامت میں کتنے ہی فرقے ابھر گئے جو متضاد قسم کے عقائد وافکار کے دلدل میں پھنسے اور پھنس کر رہ گئے۔

کوئی قدریہ بنا، جس نے خدا کی قدرت اور اس کی تخلیق تک کو خالق ومخلوق میں برابر برابر بانٹ دیا اور بندوں کو اپنے افعال کا خالق تسلیم کر لیا۔ کوئی جبریہ بنا، جس نے بندوں کو اینٹ پتھر کی طرح مجبور مطلق مان کر ان کا وہ اختیار بھی سلب کر لیا جسے نقل صحیح ہی نہیں عقل سلیم بل کہ حس بھی مانے ہوئے تھی۔ کوئی مجسّمہ بنا، جس نے خدا کے اجزا واعضا بندوں جیسے تسلیم کر لیے۔ کوئی مشبّہہ بنا، جس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا اور مخلوقاتی صفات تک اس کی طرف منسوب کیں۔ کوئی معطّلہ بنا، جس نے صفاتِ خداوندی کا سرے سے ہی انکار کر کے ذات کو صفاتِ کمال سے خالی معطل اور معرّیٰ مان لیا اور اسی کو توحید تصور کر لیا۔ کوئی لاادریہ بنا، جس نے پورے عالم اور ساری کائنات کی حسی موجودگی ہی کا انکار کر کے اسے محض خیالی اور وہمی بتایا کہ ”عالم ہمہ وہمست وخیال“ حتی کہ بعض متاخر طبقوں نے ان متقدم طبقات کے نقش قدم کو لے کر بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے صفائی سے یہ اعلان ہی کر دیا کہ جب قرآن ابدی قانون ہے اور ہر زمانے کی ضروریات اور نظریات مختلف ہوتے ہیں، تو ہم اس میں کیوں مختار نہیں کہ آیاتِ قرآنی کو وقتی حوادث کے تحت اپنے وقتی افکار وخیالات پر ڈھال لیں،

اور جو مناسبِ وقت معانی ہو، حوادث کے مناسب سمجھیں، ان ہی کو آیاتِ قرآنی کا مصداق سمجھیں! اس لیے ہمیں ان محدود الخیال علماء کی ضرورت ہے اور نہ تنگ نظر مربیوں کی حاجت۔ ہم اور ہماری عقل آزاد ہے۔ نقوشِ قرآنی سے جو بھی مناسبِ وقت مطلب لینا چاہیں، وہ لے سکتے ہیں۔

عقل و خرد کی نیرنگیاں

غرض جتنی عقلیں تھیں اتنے ہی مذہب بن گئے، اور ان عقلوں نے جب کہ وہ خود ہی امام اور خود کار بن گئیں، تو کتاب اللہ کو بھی اسی خود کاری سے اپنے تخیلات کا کھلونا بنالیا؛ تا آں کہ اس خود رائی اور ذہنی بے باکی سے فنونِ دینیہ پر بھی ہاتھ صاف ہونے لگے۔ کسی نے قرآنی آیات میں معنوی تحریف کی اور آیات کے معانی تبدیل کر کے الحاد کا ثبوت دیا:

إن الذین یلحدون فی آیاتنا لایخفون علینا / حم السجده ۴۰	بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں وہ لوگ ہم پر مخفی نہیں ہیں۔

کسی نے اسماء و صفات کے مرادی معنی چھوڑ کر اپنے من مانے معانی کا ملحدانہ اختراع کیا:

وذروا الذین یلحدون فی أسمائه سیجزون ما کانوا یعملون (الأعراف ۱۸۰)	اور ایسے لوگوں سے تعلق نہ رکھو جو اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔

اگر حدیث ان اختراعات میں حارج ہوئی، تو کسی نے حدیث کا انکار کر دیا کہ وہ حجت شرعی ہی نہیں، گویا قولِ پیغمبر بھی ان کی عقلوں کے مقابلے میں حجت نہیں۔ پھر ان الحادات میں فقہی جزئیات اور اصول تفقہ آڑے آئے، تو کسی نے فقہ کا انکار کیا؛

گویا یہ دعویٰ کیا کہ جب ہم خود فقیہ ہیں تو ہمیں پچھلوں کی فقہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس ساری فوضویت اور الحاد کا منشا وہی یہودیانہ علمی غرور اور عقلی استکبار تھا، جس کا نتیجہ جو دوانکار کے سوا دوسرا نہ تھا، جو مقدس شخصیات کی تربیت اور ان کے اتباع سے گریز کر کے کتاب محض پر اکتفا کر لینے سے نمایاں ہوا۔ قرآنِ حکیم نے اس تخیلاتی علم کی قلعی کھولتے ہوئے اسے دنیا طلبی، دنیا سازی، عدم ذکر اور غفلت وضلالت کا نتیجہ قرار دیا اور اس سے اعراض اور اجتناب کرنے کی ہدایت فرمائی:

فأعرض عمن تولى عن ذكرنا ولم يرد إلا الحيوة الدنيا ، ذلك مبلغهم من العلم ، إن ربك هو أعلم بمن ضل عن سبيله ، وهو أعلم بمن اهتدى / النجم ۲۹-۳۰

تو آپ اس کی طرف سے خیال ہی ہٹا لیجیے جو ہماری نصیحت سے بے پروائی اختیار کیے ہوئے ہیں، اور بجز دنیوی زندگی کے اس کا کوئی مقصود نہیں۔ ان لوگوں کے علم کی رسائی کی حد بھی بس یہی ہے، آپ کے پروردگار خوب جانتے ہیں کہ کون ان کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے، اور وہی اس کو خوب جانتے ہیں جو راہِ راست پر ہیں۔

دوسری جگہ دوسرے عنوان سے اس علم کو سطحی نمائشی اور ہم پلہ جہالت قرار دیا اور اس کا منشا آخرت سے غفلت اور دنیوی زندگی میں انہماک اور اس میں مستغرق ہو جانا بتلایا:

يعلمون ظاهرا من الحيوة الدنيا ، وهم عن الآخرة هم غافلون /الروم ۷

وہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں، اور وہ لوگ آخرت سے محض بے خبر ہیں۔

امت مسلمہ اور شخصیت پرستی

ادھر تیسرا طبقہ وہ بھی نمودار ہوا، جس نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگانِ دین، اور شخصیاتِ مقدسہ کی گہری عقیدت کے تحت کتابِ الٰہی کو کتابِ ساکت اور شخصیات کو

کتابِ ناطق کہہ کر ان کے ہر قول و فعل، ہر قال و حال اور ہر شخصی کردار کو اپنا دین بنالیا۔ اس میں پہل روافض نے کی، جن کا مذہب ہی شخصیت پرستی اور خاندان نوازی تھا۔ انھوں نے اہل بیتِ رسول علیہ ﷺ کی محبت کا نام لے کر دوسرے اکابر صحابہؓ تک کو نفاق اور دغل فصل کا ہدف بنایا، ان پر لعن طعن اور تبرّا تک کو عین دین سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنے چند معتقد فیہ صحابہ کو انبیاء کی طرح معصوم تک قرار دے دیا، حتی کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت میں بہ نام امامت ان کے لیے تصرف اور تغیر و تبدل کر لینے کا حق بھی تسلیم کر لیا جو نئی شریعت کو بھی نہیں ملا تھا، جس سے حقیقی رب تو چھوٹ گیا اور شخصیاتِ مقدسہ ہی ﴿ أربابا من دون الله/التوبہ ۳۱ ﴾ کے مقام پر آگئیں، جو نصاریٰ کا رویہ تھا۔ اور پھر ان کے نقشِ قدم پر محبتِ اولیاء کے نام سے کتنے ہی فرقے گروہی تعصب کے ساتھ کھڑے ہو گئے، جنھوں نے اولیاے امت کی عظمت و محبت کو عبادت کی حدود تک پہنچا دیا اور توحید کے نام سے کھلے شرک کا کارخانہ بپا کر دیا، زندہ بزرگوں کی تو سجدۂ تعظیمی کے نام سے پرستش ہونے لگی اور مردہ بزرگوں کی سجدۂ قبور سے پوجا شروع ہو گئی، ان کی قبروں کا طواف تک کیا جانے لگا، ان کے مزارات پر اعتکاف بھی شروع ہو گیا، ان سے استغاثے بھی کیے جانے لگے، ان کے نام کی منتیں بھی گزاری جانے لگیں، ان سے مرادیں بھی مانگی جانے لگیں، ان کی قبروں پر نذر و نیاز اور قربانیاں بھی دی جانے لگیں، انھیں مخاطب بنا کر ندائیں بھی کی جانے لگیں، ان سے شیئاً للہ کی پکار بھی کی جانے لگیں، حتی کہ ان کی معبودیت کے اظہار کے لیے اولاد کے ناموں میں بھی ان سے عبدیت کی نسبت اختیار کی جانے لگی، اور عبدالرسول، عبدالنبی، عبدالمصطفیٰ اور عبدالحسین وغیرہ نام تک رکھے جانے لگے، جیسے زمانہ جاہلیت میں بتوں کے نام سے عبدالعزی، عبداللات، عبدالمنات وغیرہ نام رکھے جاتے تھے، جنھیں نبی کریم ﷺ نے بدلا اور اس مصنوعی عبدیتِ غیر اللہ کو مٹایا، اور آخر کار ان شرکیہ افعال کے اثرات یہاں

تک پہنچ گئے کہ اگران أربابا من دون الله اور محلاتِ شرک کا ذکر آئے تو چہرے فرطِ مسرت سے کھلنے لگے، اور رب حقیقی اور اس کی توحید کا ذکر آئے تو چہرے سکڑنے لگے:

وإذا ذكر الله وحده اشمأزت قلوب الذين لا يؤمنون بالآخرة وإذا ذكر الذين من دونه إذا هم يستبشرون / الزمر ٤٥

اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہونے لگتے ہیں، اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں

خلاصہ یہ کہ ان توحید بیزار اور شرک پسند یا کتاب بیزار اور شخصیت گسار طبقوں میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ تو پس پشت ہو گئی اور رجال اللہ پیشِ پیشانی آ گئے اور نوعیت یہ بن گئی کہ:

وما يؤمن أكثرهم بالله إلا وهم مشركون / يوسف ١٠٦

اور ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کی مشابہت

پس ایک فرقہ شبہات کا شکار ہو گیا اور ایک شہوات میں مبتلا ہو گیا؛ ایک میں علمی فتنہ پھیلا اور ایک میں عملی فتنہ رونما ہوا؛ ایک کتاب اللہ سے کٹ کر شخصیات کا ہو رہا اور ایک مربی شخصیات سے بچھڑ کر کتاب کے نقوش ورسوم تک رہ گیا؛ ایک تکبر اور علمی غرور کے راستے سے گمراہ ہوا اور ایک تذلل نفس اور ذہنی پستی کے راستے سے بے راہ ہوا۔

ان دونوں طبقوں کے بارے میں جو یہودی افراط اور نصرانی تفریط کا نمونہ ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ مقولہ کس قدر برمحل اور آج کے دور میں کس درجہ حقیقت افزا ہے کہ جیسے وہ آج کے دور کو دیکھ کر فرما رہے ہیں:

من فسد من علمائنا ففيه شبه من اليهود ومن فسد من عبادنا ففيه شبه من النصارىٰ	جو ہمارے علماء میں بگڑا اس میں یہود کی شباہت ہے، اور جو ہمارے عباد اور درویشوں میں بگڑا اس میں نصرانیوں کی شباہت ہے۔
(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہؒ) (۱)	

بالآخر نتیجہ وہی نکل آیا جسے پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے کہ ہدایت کے ان دونوں قرآنی عنصروں (قانون وشخصیت) میں سے کسی ایک سے بھی کٹ جانا ساری ہی گمراہیوں اور علمی وعملی فتنوں کی جڑ ہے۔ اسی کے علاج کے طور پر علماءِ سلف کا یہ مقولہ کتنا حکیمانہ ہے جسے حافظ ابن تیمیہؒ نے نقل فرمایا ہے کہ:

إحذروا من الناس صنفين عالم قد فتنته هواه وعابد قد أعمته دنياه	دو قسم کے لوگوں سے بچو ایک وہ عالم جسے اس کی ہوائے نفس نے فتنے میں ڈال رکھا ہو اور ایک وہ عابد جسے اس کی دنیا نے اندھا کر رکھا ہو۔

کتاب وسنت کے جمع رکھنے کی تاکید

بہر حال، جب کہ ہدایت واستقامت اور عدل واعتدال ان ہی دو عنصروں کے جمع رکھنے میں منحصر تھا، اور اسی جمع بین الثقلین کو نبی کریم ﷺ نے اپنے ترکے میں امت کے لیے چھوڑا تھا، تو آپ نے گمراہی سے بچانے کے لیے انہی دونوں عنصروں (قانون اور شخصیت) کے جمع رکھنے میں ہدایت کو منحصر فرما دیا، جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:

تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة رسوله (مشکوٰۃ ص ۳۱) (۲)	میں نے دو امر تم میں چھوڑے ہیں، جب تک تم ان سے تمسک کرتے رہو گے گمراہ نہ ہو گے: کتاب اللہ اور اس کے رسول کی سنت۔

---

(۱) پوری کتاب میں تلاش کے باوجود یہ قول نہ مل سکا (فیصل)

(۲) رواه في الموطا في كتاب الجامع، النهي عن القول بالقدر، رقم ۱۶۱۹، ورواه أبو داؤد في المناسك باب صفة حج النبي ﷺ (۱۹۰۵) وابن ماجه في المناسك باب حج الرسول ۳۰۷۴ بلفظ آخر

کتاب سے قانون کی طرف اور سنتی سے ذاتِ اقدس اور نمونہ عمل کی طرف صاف اشارہ موجود ہے، جس سے ہدایت کے یہ دونوں عنصر (کتاب اور معلم کتاب) نمایاں ہیں۔

اتباع سلف کی ضرورت اور خودرائی کی ہلاکت خیزی

اسی طرح امت میں وہ چوتھا طبقہ بھی رونما ہوا جو ادھر تو معلم و مربی شخصیات سے بے تعلق ہونے کے وجہ سے منصوص معیاری شخصیتوں (صحابہ کرامؓ) کی معیاریت کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں؛ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک وہ خود ہی اپنا معیار ہے؛ سلف میں سے اگر کسی کا قول یا مقالہ خود اس کے اپنے معیار پر پورا اتر جائے تو قابل تسلیم ہے، ورنہ قابل رد ہے، خواہ اس روش سے شخصیاتِ مقدسہ اور سلف کی عظمت برقرار رہے یا زائل ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ جب سلف کے آثار و اقوال فہمِ مراد میں حجت نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ کتاب و سنت کو حل کرنے کی روش خودرائی اور کاغذ بینی ہی باقی رہ جاتی ہے، خواہ ماثور مرادات برقرار رہیں یا نہ رہیں۔ نیتوں کا حال تو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں؛ لیکن جہاں تک ان ظواہر افکار اور نظریات اور ان سے پیدا کردہ یا محض لفظوں کی مدد سے اخذ کردہ مسائل کا تعلق ہے، جن میں نہ مربیوں کی تعلیم و تدریس کا دخل ہو، نہ ان کی تمرین و تربیت کا واسطہ، اور نہ ہی ان میں وہ متوارث ذوق شامل ہو جس کے لیے ذاتِ نبوی کی خاص صفت ویز کیھم ارشاد فرمائی گئی، جس کے ذریعے سلف اور خلف نے کتنی کتنی ریاضتِ شاقہ اور مجاہدات سے اپنے نفوس کو بہ تربیتِ مربیانِ قلوب مانجھا اور با استقامت بنایا، اور جو خلفاً عن سلف منتقل ہوتا آرہا ہے، تو ان تخیلاتی مرادات اور مفاہیم کو سوائے مراداتِ نفس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے! بدیں وجہ مسائل دین کے حل

واخذ کی یہ مزعومہ بنیادیں جو عرض کردہ عناصر سے خالی ہوں، اہل سنت کے اس مسلمہ طریق کے کلیتًا خلاف ہے اور فہم شریعت کے اس مرکب قرآنی اصول (جمعِ کتاب و معلم کتاب) یا تعلیم و تربیتِ نفوس یا علم و عشق سے ہٹی ہوئی ہے جو امت کا مسلوک راستہ رہا ہے، اور جس کی تفصیل سابقہ سطور میں بہ دلائل عرض کی جا چکی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب فہم دین کی خشتِ اول ہی کج ہو تو اوپر کی تعمیر کی راستی معلوم ہے! ہو سکتا ہے کہ راستے سے کچھ معقول اور صحیح باتیں بھی فروعی طور پر ان سے نمایاں ہو جائیں؛ لیکن جب ان کے اخذ کی اصل اور بنیاد ہی صحیح نہ ہو تو

خطا اگر راست آید ہم خطا است

(خطا اگر درست ہو جائے تو بھی خطا ہے)

بہر حال، اس مرکب راہِ ہدایت کے معیار سے بے راہی، یا بالفاظِ قرآنی گمراہی کی چار صورتیں نکلتی تھیں، جن کے تحت اقوام و امم میں چار ہی قسم کے طبقے رونما ہوئے، اور ان چاروں کی مثالیں اس امت میں بھی حسبِ اخبار نبوی بہ تفاوتِ درجات چار ہی طبقوں کی صورت میں نمایاں ہوئیں، جن کی تفصیل عرض کر دی جانی ضروری تھی، ورنہ اہل السنّت والجماعت کے اصل مسلک کی پوری وضاحت نہ ہو سکتی، جب تک کہ خلاف اصل کا تذکرہ نہ کیا جاتا؛ مگر جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے، اس میں نہ کسی کی شخصیت پیش نظر ہے، نہ پارٹی اور جماعت؛ بل کہ جو کچھ بھی زیرِ قلم آیا، وہ محض اصولی بحث کے طور پر آیا ہے، جس کا مقصد اہل السنّت والجماعت کے مسلک کی تشریح اور اس کی مخالف سمت کی توضیح ہے، تا کہ اہل السنّت والجماعت اپنی اصل اور اپنی ضد کے تقابل سے پوری طرح کھل جائے:

وبضدها تتبين الأشياء

اہل سنت والجماعت کمال اعتدال کا نقیب

اب اگر ضمیر کی صداقت سے نظر ڈالی جائے تو کتاب و معلم کتاب میں سے کسی ایک سے انقطاع اور دوسرے سے غالیانہ جوڑ، اور یہود و نصاریٰ کی افراط و تفریط سے بچ کر اگر کوئی طبقہ ان دونوں عنصروں سے پوری عقیدت و عظمت اور کمال اعتدال کے ساتھ پیروی کا تعلق قائم کیے ہوئے ہے، تو وہ صرف اہل سنت والجماعت کا طبقہ ہے، جو نہ کتاب اللہ کو معلمینِ کتاب اور مربیانِ نفوس کی تعلیم و تربیت کے بغیر سمجھنے کی بلا میں گرفتار ہے، کہ خدائی قانون کو اپنی رایوں اور نظریات کا کھلونا بنالے، اور نہ مربیوں کی غلو زدہ عقیدت و محبت کا شکار ہے، کہ ان کے ہر شخصی حال و قال و کردار و گفتار کو قانون کی حیثیت دیتا ہو؛ چناں چہ ان رجال اہل سنت والجماعت اور ان کی تمام شخصیاتِ مقدسہ کے مورثِ اعلیٰ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی عظمت اور محبت کے بعد سلفِ صالحین میں اولاً صحابہ کرامؓ کی ذواتِ قدسیہ کی (جو اولین راویانِ دین اور موصلانِ ایمان و یقین ہیں) نہ صرف عقیدت و اطاعت ہی کا جذبہ دلوں کی گہرائی میں لیے ہوئے ہیں، بل کہ ان کی محبت کو بھی حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں اور اسے تکمیل ایمان کا وسیلہ سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی محبت در حقیقت حضور ﷺ کی محبت کی فرع اور اسی سے وجود یافتہ ہے، جس کو حضور ﷺ ہی نے ارشاد فرما دیا ہے کہ:

من أحبهم فبحبي أحبهم و من أبغضهم فببغضي أبغضهم (١)	جس نے ان (صحابہؓ) سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے محبت کی، اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے بغض رکھا

---

(١) أخرج أحمد عن عبدالله بن مغفل المزني ٤/٥٧ و ٥٤

محبتِ صحابہ تکمیل ایمان کی علامت

اس حدیث کی رو سے صحابہؓ کی محبت وعداوت کا منشا درحقیقت محبت وعداوتِ نبویؐ ہے، اس لیے اگر محبتِ نبویؐ ایمان کے لیے ضروری ہے تو محبتِ صحابہ تکمیل ایمان کے لیے ضروری ہے۔ اگر محبتِ نبویؐ اصل ایمان ہے تو محبتِ صحابہ فرعِ ایمان ہے، اور فرع کی محبت اصل ہی کی محبت سمجھی جاتی ہے، جس کی بنیاد اس کے سوا دوسری نہیں کہ جو اسبابِ محبت حضورﷺ کی ذاتِ بابرکات میں بہ طور اصل کے ہیں، وہی آپ کے فیضانِ صحبت سے جماعتِ صحابہ میں بہ طور فرع کے جمع ہیں؛ اس لیے قرآنِ حکیم نے صحابہ کے پورے طبقے کو من حیث الطبقہ مقدس، پاک باطن، پاک ضمیر، راشد ومرشد، راضی و مرضی، ہادی ومہدی اور مطاع ومتبوع قرار دیا ہے، جس سے اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ:

الصحابة کلهم عدول — صحابہ سب کے سب (بلا استثنا) عادل ومتقن ہیں

وہ ان کے تخطیہ وتنقیص کو فسق جانتے ہیں اور اس کے مرتکب کو لائقِ تعزیر سمجھتے ہیں!

غور کیا جائے تو صحابۂ کرام کا یہ عدالت واتقان، یہ تقویٰ باطن، یہ راضی ومرضی ہونا اور بہ نصِ حدیثِ نبویؐ ان کا زیرِ حمایتِ نبوی ہونا کہ کوئی میرے صحابہ کو برائی یا سب وشتم یا لعن وطعن سے یاد نہ کرے، ان کا وہ جمالِ ظاہر وباطن ہے جس نے ان کی محبت کو مسلمان کی طبیعتِ ثانیہ بنا دیا ہے۔

محبت وتنقید کا تضاد

پس صحابۂ کرام سے اہل سنت والجماعت کا تعلق محض تاریخی یا روایتی یا محض استنادی نہیں، بل کہ عشقی ہے؛ اس لیے وہ انہیں محض مقتدا ہی نہیں بل کہ محبوب القلوب بھی مانتے ہیں، اور ان کے اس جمال پر فریفتہ بھی ہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اہل سنت

والجماعت، رافضیت اور خارجیت دونوں سے علاحدہ ہوجاتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے یہاں سارے صحابہ بلا استثنا نہ عدول و متقن ہیں، نہ پارسا اور نہ سب کی محبت بجز ان کے چند معتقد فیہ صحابہ کے ضروری ہے۔ ساتھ ہی حدیثِ بالا کی رو سے یہ مسئلہ بھی بہ آسانی حل ہوجاتا ہے کہ دعوائے محبت و عقیدت کے ساتھ صحابہ قابلِ تنقید نہیں ہوسکتے۔ شرعی اور فقہی حکم تو اپنی جگہ ہے، اخلاقی اور عقلی نقطۂ نظر سے بھی محبت اور تنقید کا جمع ہونا ضدین کا جمع ہوجانا ہے؛ ایک شخص یہ بھی کہے کہ فلاں شخص نہایت حسین و جمیل اور بے حد شکیل و وجیہ ہے، جو میرا محبوب بھی ہے اور میں اس کا گرویدہ اور عاشق بھی ہوں، اور اسی آن یہ بھی کہے کہ لیکن اس کی آنکھ، ناک میں کچھ خرابی بھی ہے، اس کا رنگ روغن کچھ میلا سا بھی ہے، اس کا قد و قامت بھی کچھ موزوں نہیں، اعضا میں کچھ پورا تناسب بھی نہیں اور بدن جگہ جگہ سے نقص بھی لیے ہوئے ہے، تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ آخر تجھے اس کا عاشق بننے پر کس نے مجبور کیا تھا کہ بہ ایں نقص و کوتاہی تو خواہ مخواہ اس کا عاشق بھی بنے، اس کے حسن و جمال پر فریفتہ بھی ہو اور ساتھ ہی اس حسن و جمال پر تنقید کر کے اس میں خرابیاں بھی نکالے، جو کھلا اجتماعِ ضدین ہے!

صحابہ معیارِ کامل

پھر شرعی طور پر دیکھا جائے تو ایک طرف تو حدیثِ نبویؐ انہیں، فرقوں کے ناجی وناری ہونے کا معیار بتلائے، انہیں بہ نصِ قرآنی واجب الاطاعت بھی کہے جو ان کے اسی جمالِ ظاہر و باطن کا ثمرہ ہے، اور دوسری طرف مدعیانِ محبت ان کی بے معیاری کا تخیل بھی قائم کریں؛ یا بہ الفاظِ دیگر ان کے بارے میں خود معیار بن کر ان کے جمال پر تنقیدیں بھی کریں، تو اسے ''یک بام و دو ہوائے'' کے سوا اور کیا کہا جائے گا! اگر وہ فرقوں کے حق و باطل کا معیار ہیں، اور بلاشبہ ہیں، تو کسوٹی بھی اگر قابل نقد و تبصرہ

ہو جائے، تو سونے چاندی کا کھرا کھوٹا ہونا پھر کون بتلائے گا؟

حقیقت یہ ہے صحابہ کرام کسوٹی ہو کر امت کے حق میں ناقد ہیں نہ کہ منقود، وہ امت کے بہتر (٧٢) فرقوں کے حق و باطل پہچاننے کا معیار ہیں، نہ فرقے یا پارٹیاں ان کے حق میں معیار ہیں؛ اس لیے یہ عظمائے امت اور محبوب القلوب افراد، مذکورہ حقیقت کی رو سے تنقید سے بلاشبہ بالاتر ہیں، اور بالاتر سمجھنے کی پہلی کڑی ان کی بلا استثنا محبت و عقیدت اور مطاعیت ہوگی، نہ کہ بہ نامِ تنقید ان کی تنقیص اور تغلیط۔

ترجیح اور تنقید کا فرق

البتہ ان کے مختلف اقوال میں ترجیح و انتخاب کا حق علمائے مبصرین کو ہوسکتا ہے جو سندِ متصل کے ساتھ بذریعۂ درس و تدریس علم و عمل اور اخلاق حاصل کیے ہوئے ہوں، جیسے خود حدیثِ متعارضہ میں ائمۂ فقہ و حدیث کو ترجیح و انتخاب کا حق ہے؛ لیکن اس کا نام تنقید نہیں، اور یہ حق بھی علمائے مبصرین کو ہوگا نہ کہ ہر کس و نا کس کو۔

پس ان کے کسی شرعی یا اجتہادی قول کو ان میں سے کسی دوسرے کے قول پر ترجیح دینا اور ہے، اور مرجوح قول کو غلط یا نقصان آمیز کہنا اور ہے، جیسے متعارض حدیثوں میں کسی حدیث کو بہ لحاظِ تفقہ دوسری حدیث پر راجح کہنا اور ہے اور مرجوح کو غلط بتانا اور ہے، اس روگ سے اگر کوئی طبقہ بری اور خالی ہے تو وہ اہل السنّت والجماعت کا طبقہ ہے، جنھیں حق تعالیٰ نے بہ طفیلِ صحبت و معیتِ اکابر و اسلاف، زیغ قلب اور کج روی سے بچا کر راستیِ فہم، سلامت روی اور استقامت ذہنی کا جوہر عطا فرمایا، اور وہ بلا استثنا اقوالِ صحابہ کو سچا اور حق جان کر اگر متعارض اقوال میں ضرورت سمجھتے ہیں تو ان میں قواعدِ شرعیہ کے تحت ترجیح و انتخاب کرتے ہیں، مگر ان کے کسی بھی قول میں نقص نکالنے کی

جرأت نہیں کرتے؛ کلام اگر کرتے بھی ہیں تو سند پر کرتے ہیں نہ کہ متن روایت پر؛ پس جو رویہ وہ احادیث متعارضہ میں اختیار کرتے ہیں وہی متعارض اقوال صحابہ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولی طور پر کتاب وسنت کی تشریح وتوضیح انہیں سلف کے اقوال میں محدود کر کے اور ان کا پابند ہو کر کرتے ہیں، اور ہر صورت میں انہیں اپنے دین اور دینی روایات کی مراد فہمی اور مفہوم دانی کا معیار جانتے ہیں، تو قدرتی طور پر حدیثی معیار کی رو سے ان بہتر فرقِ زائغہ کے ماحول میں اہل السنّت والجماعت ہی فرقۂ حقہ کہلانے کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ہدایت کے ان دونوں عنصروں (قانون اور شخصیت) کو علیٰ قدرِ مراتب قائم رکھا اور سرتاپا اس کے پیرو رہے۔

مجتہدینِ ملت اور علمائے ربانی کا مقام

پھر اسی طرح شخصیاتِ مابعد میں جو مقدس افراد صحابہؓ ہی کے متوارث فیضان سے سلسلہ بہ سلسلہ تربیت پا کر ظاہر ہوئے جیسے: راسخین فی العلم مجتہدین ملت، علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کہ وہ ان کی شخصیات کو بھی بہ لحاظِ تعلیم وتربیت اور بہ لحاظ فیضانِ صحبت ومعیت پورے ادب واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور روایت ودرایت میں ان کے مشرب وذوق کو بنیاد بنا کر ان کے اتباع کے دائرے سے باہر نہیں ہوتے، تو اس سے صاف نمایاں ہے کہ ان کا ذوق ومشرب یہی جامعِ سنت وشخصیت، جامعِ روایت ودرایت اور جامعِ عقل وعشق مشرب ہے، جس سے وہ اہل سنت والجماعت کہلائے، اور بہتّر فرقوں میں سے فرقۂ ناجیہ قرار پائے، جن کا رشتہ سندِ متصل کے ساتھ صحابہؓ

کرام سے گزرتا ہوا ذاتِ نبوی ﷺ سے بلا انقطاع جڑا ہوا ہے، حتی کہ ان کی کتب دینیہ کا رشتہ بھی کتاب وسنت سے بلا انقطاع وابستہ ہے؛ جس سے واضح ہے کہ یہ فرقہ کوئی نوزائیدہ یا نومولود فرقہ نہیں، جسے وقت کے نظریات نے پیدا کر دیا ہو، بل کہ قدیم العہد اور سالف الایام فرقہ ہے۔

اہل سنت والجماعت دینِ حق کے حقیقی ترجمان

اسی لیے صحابہ کرام کی حد تک تو یہ فرقہ اسلامی فرقوں کے حق میں معیارِ حق رہا، جسے آنحضرت ﷺ نے اپنی ذاتِ اقدس کے ساتھ ملحق فرما کر معیارِ حق قرار دیا، جیسا کہ حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

وإن بنی إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلاملة واحدة، قالوا من هي يا رسول الله؟ قال ما أنا عليه وأصحابي (مشكوٰة شريف، باب الاعتصام بالكتاب والسنة ص ٣٠) (١)	یقیناً بنی اسرائیل بہتر (۷۲) ملتوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) ملتوں میں بٹ جائے گی جو تمام جہنم رسید ہوں گے بجز ایک کے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ! وہ ایک ملت کون سی ہے؟ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں

اور بعد کے زمانوں میں بھی یہی فرقہ علامتِ حق ثابت ہوا، جیسا کہ ما أنا عليه وأصحابي کے دوامی رخ کلمے سے ظاہر ہے۔

---

(١) ترمذی باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة (٢٦٤١)

اہل سنت والجماعت کی لفظی حقیقت

یہی وجہ ہے کہ اس کا مرکب لقب اہل سنت والجماعت جس سے ما اور أنا و أصحابی دونوں پر مساوی روشنی پڑتی ہے، قرنِ اول ہی کا تجویز فرمودہ ہے، قرون مابعد کا ایجاد کردہ نہیں، اس لیے یہ لقب بھی نوزائیدہ یا نومولود نہیں، جیسا کہ خود یہ فرقہ ناجیہ نوزائیدہ نہیں؛ چناں چہ ابن عباسؓ کا اثر جو شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب "البدور السافرۃ" میں لالکائی اور ابن [أبي] حاتم سے ﴿ یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ ﴾ کی تفسیر میں نقل کیا ہے، اس بارے میں شاہد عدل ہے:

عن ابن عباسؓ فی هذه الآية يوم تبيض وجوه وتسود وجوه قال تبيض وجوه أهل السنة والجماعة وتسود وجوه أهل البدع والضلال (البدور السافرة، ص ١٤٣، مطبوعہ اسٹیم پریس لاہور، وتفسیر الدر المنثور) (١)	حضرت ابن عباسؓ سے آیۂ کریم یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ قیامت کے روز اہل سنت والجماعت کے چہرے روشن ہو جائیں گے اور بدعتیوں اور گمراہ لوگوں کے چہرے کالے ہو جائیں گے

اس اثر سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ اہل سنت والجماعت ہی قدیم جماعتِ حقہ ہے، بعد کا بنا ہوا کوئی فرقہ نہیں، بل کہ اصل ہے اور بعد کے فرقے اس سے کٹ کر بنے ہیں جو اس کی قدامت اور اصل ہونے کی واضح دلیل ہے؛ ورنہ صحابہ نے آخر یہ

---

(١) أخرجه ابن أبي حاتم وأبو نصر في الإبانة والخطيب في تاريخه واللالكائي في السنة عن ابن عباس...... (الدر المنثور ٢/٢٩١ طبع دار الفكر)

اور ابن عمرؓ اور ابو سعید خدریؓ نے خود حضور ﷺ سے اس طرح کے الفاظ نقل کیے ہیں، دیکھیے الدر المنثور ٢/٢٩١، حضرت ابو سعیدؓ کی روایت کو آگے حضرت قاری صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔

لقب کس کا تجویز کیا تھا اگر اس وقت اس لقب کی مستحق کوئی جماعت موجود نہ تھی!

دوسرے اسی اثر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس جماعتِ حقہ کا یہ لقب صحابہ میں معروف بھی تھا، اسی لیے ابن عباسؓ کو اس کا تعارف کرانا نہیں پڑا، بل کہ نام اور لقب ذکر کر دینا کافی سمجھا گیا، جو اس کے معروفِ عام ہونے کی واضح دلیل ہے۔

تیسرے اس جماعت حقہ (اہل السنۃ والجماعۃ) کا اس کی مقابل جماعت سے تقابل ڈال کر اس کی حقانیت وہدایت یافتگی کو کھول دیا جانا اس کی دلیل ہے کہ اس کی متقابل اور مخالف جماعتیں اہل بدعت وضلال ہیں؛ اس لیے صرف یہی ایک جماعت (اہل سنت والجماعت) ہو سکتی تھی کہ سنت نبویؐ اس کے عنوان کا سرنامہ بنے، نہ کہ وہ جماعتیں جو بعد کی پیداوار ہیں اور ان کا سرنامہ رواجات وبدعات، یا وقت کے محدثات ہوں، اور اس فرقۂ حقہ کی ضد ہوں۔

چوتھے اس اثر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اہل السُّنۃ اسی جماعت کا لقب ہو سکتا ہے جس کے مقابلہ پر اہل بدعت آئے ہوئے ہوں؛ اس لیے کسی ایسی جماعت کو اپنے حق میں یہ لقب استعمال کرنے کا حق بھی نہیں رہتا، جو اس جماعت کے بالمقابل تجددات اور محدثات میں ملوث ہو اور سنتِ نبویؐ اور تعاملِ صحابہ کے خلاف کوئی راہ اختیار کیے ہوئے ہو، جس کی بنیادیں سنتِ نبویؐ اور تعامل میں نہ ملتی ہوں؛ اس لیے یہ لقب بھی ان جماعتوں کا نہیں ہو سکتا جو اس جماعتِ حقہ سے کٹی ہوئی ہوں، جب کہ یہ جماعتیں بعد ہی کی پیداوار ہوں گی جو نوزائیدہ کہلائیں گی۔ بہر حال، اس اثر سے اس جماعت کا صرف یہ مرکب لقب ہی قدیم الایام ثابت نہیں ہوتا، بل کہ اس جماعت کی بنیادی حیثیت بھی بہ صورتِ قدامت کھل کر سامنے آجاتی ہے، کہ ان کی اصل بنیاد سنتِ نبویؐ اور ذاتِ نبویؐ اور بعد میں تعامل صحابہ اور ذواتِ صحابہ کی پیروی

ہو، جن کے اجماع کو دین میں قانونی حجت کا درجہ حاصل ہے؛ ورنہ اس کے سوا سب جماعتیں درجہ بدرجہ شخصی خصوصیات اور رواجی احوال کی جماعتیں ہیں، جو قانونی حیثیت کا درجہ نہیں پاتیں، کہ ہر کس و ناکس کے لیے پیغام اور حکم کا درجہ رکھتی ہوں!

کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو اس جماعتِ حقہ کا یہ لقب صرف ایک صحابی ہی کے اثر سے ثابت نہیں ہوتا، بل کہ حدیثِ مرفوع میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے، چناں چہ عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث کا جو گزر چکی ہے، جسے ترمذی نے روایت کیا ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے جو ارشادِ نبوی ہے:

وإن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين و سبعين ملة و تفترق أمتي على ثلاث و سبعين ملة كلهم في النار إلا واحدة قالوا من هي يا رسول الله ؟ قال ما أنا عليه وأصحابي (مشكوٰة شريف) (١)	یقیناً بنی اسرائیل بہتر (٧٢) ملتوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (٧٣) ملتوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنم رسید ہوں گے، صرف ایک محفوظ رہے گا، صحابہ کرامؓ نے پوچھا وہ ایک فرقہ کون سا ہے یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ (وہ فرقہ ہے جو اس طریق پر ہوگا) جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

”السنة“ کی توضیح

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے امت کے تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پہچاننے کے لیے معیارِ حق دو ہی چیزوں کے مجموعہ کو قرار دیا ہے جو کلمۂ ما اور کلمۂ أنا وأصحابي سے ظاہر فرما دیا ہے، جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مآ سے اشارہ روشِ نبوی، دستورِ نبوی اور اسوۂ نبوی کی طرف ہے، جس پر آپ اور آپ کے صحابہ قائم

---

(١) ترمذی باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة (٢٦٤١)

تھے، اور ظاہر ہے کہ اسی روشِ نبوی اور اسوۂ حسنہ کا نام ''السنّۃ'' ہے جس پر آپ خود چلے اور اپنے صحابہ کو چلایا؛ اس لیے کلمۂ مَآ سے تو السنۃ کا عنوان نکلا جو فرقۂ حقہ کے لقب کا پہلا جز ہے، اور کلمۂ اَنَا وَاَصحابِی کا مصداق ظاہر ہے کہ برگزیدہ شخصیتیں ہی ہو سکتی ہیں، جب کہ ان کی ابتدا میں ذاتِ اقدس نبوی اور آپ کے صحابہ کے ذواتِ قدسیہ ہیں اور قرونِ مابعد میں تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین، فقہائے مقدسین، علمائے راسخین اور مشائخِ حقانیین متعین ہیں، اس لیے اَنَا وَاَصحابِی کا مفہوم ''الجماعۃ'' کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جو اس جماعت کے لقب کا دوسرا جز ہے جس کا مجموعہ وہی ''اہل السنّت والجماعت'' بن جاتا ہے۔

پس اس لقب کے بارے میں جو کچھ ابن عباسؓ نے اپنے اثر میں صراحتاً ارشاد فرمایا تھا، وہی اس حدیث مرفوع سے ثابت ہوا، جس سے صاف واضح ہے کہ اس جماعتِ حقہ کا یہ لقب تجزیے کے انداز سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد فرمودہ ہے، جس کی وضاحت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے۔ اس سے زیادہ اس جماعت کے اصل اور قدیم ہونے اور ساتھ ہی اس کے اس مرکب لقب کے قدیم ہونے میں شک وشبہ کی کیا گنجائش باقی رہ سکتی ہے!!

الجماعۃ کی تحقیق

اب اگر اس حدیث ابن عمرؓ کے ساتھ امام احمدؒ اور امام ابوداوٗدؒ کی یہ روایت بھی ملالی جائے جو حضرت معاویہؓ سے مروی ہے، اور اسی واقعے پر مشتمل ہے جو حدیث ابن عمرؓ میں بیان کیا گیا ہے، تو یہ حقیقت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے گی، جس کے الفاظ صاحبِ مشکوۃ نے حدیث ابن عمرؓ کے بعد ''وفی روایۃ'' کے عنوان سے نقل کیے

ہیں، جس سے خود واضح ہے کہ صاحبِ مشکوٰۃ کے نزدیک ابن عمرؓ کا تتمہ یہی حدیثِ معاویہؓ ہے، اور دونوں ایک ہی واقعہ، ایک ہی موضوع اور ایک ہی حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ صاحبِ مشکوٰۃ فرماتے ہیں:

وفي رواية أحمد وأبي داؤد عن معاوية ثنتان وسبعون في النار وواحد في الجنة وهي الجماعة (مشكوٰة شريف، ص ٣٠)	امام احمد اور امام ابوداؤد کی روایت میں حضرت معاویہؓ سے یہ مروی ہے کہ "بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ الجماعۃ ہی ہے"۔ (۱)

اس روایت میں "أنا وأصحابي" کے مفہوم کو الجماعت کے عنوان سے ادا کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ "أنا وأصحابي" کی جو مراد یعنی "الجماعۃ" حدیث ابن عمرؓ سے معنیً سمجھی گئی تھی، اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ روایت معاویہؓ تصریح لفظوں میں خود اپنی مراد ظاہر فرما دیا ہے؛ اس لیے "أنا وأصحابي" کے معنی تو حدیث مرفوع کی عبارت یعنی عبارت النص سے واضح ہو گئے کہ وہ الجماعۃ کے ہیں، جس سے اس الجماعۃ کے بارے میں کسی استنباطی اور استدلالی تقریر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جب کہ أنا وأصحابي کے معنی خود صاحب نبوت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ہی کی طرف سے متعین ہو گئے کہ وہ الجماعۃ کے ہیں جو اس فرقۂ حقہ کے مبارک لقب کا دوسرا جز ہے۔

---

(١) رواه ابن ماجه في كتاب الفتن، باب افتراق الأمم (٣٩٩٣) ورواه احمد في مسنده (١٠٢/٤)، وكذا في مسند أنس بن مالك بلفظ "الجماعة الجماعة (١٤٥/٣) ابوداؤد کی روایت میں یہ ٹکڑا موجود نہیں ہے۔

ما أناعليه کا مفہوم

رہا یہ کہ اس تتمہ والی حدیثِ معاویہ میں الجماعۃ کی طرح کلمۂ ما کا مفہوم ادا نہیں ہوا، جس کے معنی قانون، دستور یا سنتِ نبوی کے تھے، فقط شخصیاتِ مقدسہ ہی پر روشنی پڑی، اور وہ بہ ظاہر منصوص ہونے سے رہ گیا؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو الجماعۃ ہی کے لفظ میں ''السنۃ'' بھی موجود ہے، گو ضمناً ہو؛ کیوں کہ صحابہ کی جماعت کا دستورالعمل سنت کے سوا دوسرا تھا ہی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا دستورِ زندگی معاذ اللہ البدعۃ تھا! بل کہ وہ سنت میں اس طرح ڈھلے ہوئے تھے کہ ان کی ذوات اور سنت گویا ایک ہوگئی تھی؛ اس لیے ان کا ذکر بعینہٖ سنت ہی کا ذکر ہو سکتا ہے، نہ کہ البدعۃ کا؛ اس لیے الجماعۃ کے لفظ سے جہاں برگزیدہ شخصیتیں اس حدیث کے مصداق ثابت ہوئیں، وہیں بہ اقتضاء کلمۂ الجماعۃ اسی لفظ الجماعۃ سے ان کا دستور السنۃ بھی خود بخود متعین ہو کر ثابت ہو گیا، جب کہ صحابہ کو صحابہ اس السنۃ ہی نے بنایا تھا، نہ کہ معاذ اللہ البدعۃ نے؛ اس لیے اس حدیثِ معاویہؓ میں الجماعۃ کے ایک ہی کلمے نے وہ دونوں حقیقتیں جمع کر کے ادا کر دیں جو حدیثِ ابن عمرؓ میں مَا اور اَنَا کے دو کلموں سے الگ الگ ادا ہوئی تھیں؛ بل کہ ذخیرۂ حدیث پر حاوی نظر ڈالی جائے تو ما اور أنا کے جمع کرنے کا حدیث مذکورہ میں جو مفہوم قدرے استنباط سے نمایاں کیا گیا تھا، وہ حدیث ابوسعید خدریؓ میں بلا استنباط نصاً جمع شدہ بھی موجود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرأ يوم تبيض وجوه وتسود وجوه قال تبيض وجوه أهل الجماعات والسنة وتسود وجود أهل البدع والأهواء (إبانه ابو نصر تفسير درمنثور)

خطیب بغدادی کی تاریخ میں بھی یہ روایت موجود ہے۔(۱) اس روایت میں "الجماعۃ" کی جگہ الجماعات جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، خواہ اس وجہ سے کہ صحابہ جب مختلف بلاد میں منتشر ہوئے تو وہ جماعات ہی کے روپ میں نمایاں ہوئے، اس وجہ سے کہ صحابہ کے بعد ان کی تربیت کردہ جماعتیں متعدد ہو گئیں جنھیں اس جمع کے صیغے سے نمایاں فرما دیا گیا۔ بہر حال، اس طرح یہ مبارک لقب (اہل السنۃ والجماعت) تین حدیثوں اور ایک اثر صحابی سے ثابت ہو کر ایک مستحکم اور غیر مشکوک حقیقت ثابت ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طبقے کا وجود بھی ذاتِ اقدسِ نبویؐ ہی سے تشکیل یافتہ ہو، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو بھی شمار فرمایا ہو، پھر اس کا لقب اہل السنۃ والجماعۃ بھی مشکوٰۃِ نبوت ہی سے نکلا ہوا ہو، اور پھر صحابۂ نبوی ہی نے اسے شائع بھی فرمایا ہو، تو اس طبقے کے مستند، حقانی، قدیم اور اصل ہونے میں شک وشبہے کی گنجائش ہی کیا باقی رہ سکتی ہے؟

وکفیٰ بھم فخراً

فرقۂ ناجیہ

حاصل یہ نکلا کہ جس جماعت میں السنۃ اور الجماعۃ کے دونوں بنیادی عنصر موجود ہوں، قرنِ نبوت سے تسلسل اور سندِ متصل کے ساتھ اس کا سلسلہ ملا ہوا ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم سے سلسلہ بہ سلسلہ اس کی توثیق ہوتی آ رہی ہو، صحابہ کی اس پر شہادت اور اشاعت کی مہر ثبت ہو، تو وہی جماعت فرقۂ حقہ ہو گی، اور اسی کو قدیم اور اصل کہا

---

(۱) خطیب بغدادی کی تاریخ کے حوالے سے سیوطی نے درمنثور میں نقل کیا ہے، لیکن غالباً نسبت میں سیوطی سے غلطی ہوئی ہے، بہت تلاش وتحقیق کے باوجود تاریخ بغداد میں یہ روایت ہمیں نہیں ملی (فیصل)

جائے گا، نہ کہ نوزائیدہ اور نومولود یا وقت کی پیداوار کو، جو ان دو عنصروں میں سے کسی ایک سے کٹی ہوئی ہوں؛ اس لیے جو طبقہ اس سے کٹ جائے گا وہی اختلاف کنندہ شمار کیا جائے گا، نہ کہ اس جماعت کو جس کی اصل کسی اختلاف وشقاق کی زمین پر قائم نہیں، بل کہ اصل پر قائم ہے؛ اس لیے اسے اختلاف کنندہ، یا شقاق پر قائم شدہ نہیں کہا جائے گا؛ اس لیے صحابہؓ جیسا ایمان لانے کو ایمان کا معیار فرمایا گیا، جس سے ان کی اطاعت وپیروی کا وجوب بھی نمایاں ہے۔ فرمایا گیا:

فإن آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا، وإن تولوا فإنما هو في شقاق فسيكفيكهم الله، وهو السميع العليم، صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة ونحن له عبدون (البقرة ۱۳۷-۱۳۸)

سو اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان رکھتے ہو تو بے شک وہ بھی راہ پا گئے، اور اگر منہ موڑتے ہیں تو بس بڑی مخالفت میں پڑے ہیں، سو اب اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے عنقریب ہی ان سے نپٹ لیں گے، اور وہ سب کچھ سننے والے ہر چیز جاننے والے ہیں، (ہمارے اوپر) اللہ کا رنگ ہے اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کون رنگ دینے والا ہے، ہم تو انہی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کی معنوی جامعیت

اب اگر غور کیا جائے تو یہی لقب (اہل السنۃ والجماعۃ) اس فرقۂ حقہ کی جامعیت واعتدال اور دینی مزاج کو ظاہر بھی کر سکتا تھا، جو اس فرقہ میں کتاب وشخصیت کے امتزاج سے قائم ہوا؛ دوسرا کوئی بھی لقب اس جامع حقیقت کو ادا نہیں کر سکتا تھا، مثلاً علمی معیار سے اگر ان کا لقب اہل القرآن یا اہل الحدیث یا اہل الفقہ یا اہل الکلام یا اہل التصوف ہوتا، یا جماعتی نقطۂ نظر سے مثلاً جماعتِ دینی یا جماعتِ ایمانی یا جماعتِ

اسلامی ہوتا، تو اس سے ماؔ کا مصداق یعنی قانون یا ملت یا طریق وراہ تو کسی حد تک ذہنوں میں آجاتا؛ لیکن اَنا کا مصداق یعنی شخصیاتِ مقدسہ اور رہنمایانِ طریق سے انتساب اور ان سے استناد یا تربیت یافتگی کا سلسلہ نمایاں نہ ہوتا، جو مسلک کا بنیادی عنصر ہے؛ اور یہ نہ کھلتا کہ آیا وہ کسی تربیت یافتہ طبقے کی تعلیم وتربیت سے اس مقام پر پہنچے ہیں، یا ازخود ہی کوئی خودرو جماعت بن بیٹھے ہیں؛ بل کہ یہ نمایاں ہوتا کہ یہ طبقہ کاغذ اور اس کے حروف ونقوش سے لگا ہوا اپنی آزادرائے کا پابند ہے جسے کوئی مربی نصیب نہیں ہوا کہ متوارث ذوق سے اس کی تربیت کرسکتا، اس لیے یہ تمام القاب آدھے، اکھرے اور ناتمام ہوتے!

اور اگر انتسابی طور پر مثلاً ان کا لقب عاشقانِ رسول یا محبانِ صحابہ یا محبین اہل بیت یا اَتباع المحدثین یا اصحاب الفقہاء یا والہان اولیاء اللہ ہوتا، تو اس سے اَنا کی طرف تو اشارہ ضرور ہو جاتا، لیکن ما کے کلمے کا حق ادا نہ ہوتا، اور یہ سمجھا جاتا کہ یہ فرقہ شخصیت پرست یا متعصّبانہ مزاج سے کوئی فرقہ پسند طبقہ ہے، جس کے پاس شخصیتوں کے تصور کے سوا کوئی اصولی دستوری اور کھلا قانون نہیں، جس کی پیروی کر کے وہ جائز وناجائز میں امتیاز کرے؛ اس لیے یہ القاب بھی آدھے ناتمام اور اکھرے ہوتے، جس سے ان کے مسلک کی جامعیت پر کوئی روشنی نہ پڑسکتی؛ اس لیے اس فرقۂ حقہ کا جامع لقب سوائے ''اهل السنة والجماعة'' کے دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا، جس سے بیک وقت ہدایت کے دونوں بنیادی عنصروں: کتاب وشخصیت یا علم اور اساطینِ علم اور مربیانِ امت کے مجموعے سے ان کے دینی رخ اور مسلکی مزاج پر روشنی پڑسکتی؛ اور ظاہر ہوتا کہ وہ بیک وقت اصولیت وشخصیت، بصیرت ومتابعت، وقار وتواضع اور علم اور عشق کا جامع ہے، جس کے لیے یہی مرکب عنوان سزاوار تھا۔

خودساختہ جماعتیں اور خودساختہ القاب

پھر یہ کہ جولقب بھی اس کے سوا ہوتا، وہ خودساختہ ہوتا جیسے نئی جماعتیں اپنی تشکیل کے مناسبِ حال خود ہی اپنا کوئی لقب تجویز کرلیتی ہیں؛ مگر یہ جماعتِ حقہ جب کہ خود ہی کوئی نئی جماعت یا نئی تشکیل نہ تھی، بل کہ قرنِ اول سے تشکیل پائے ہوئے تھی، اس لیے اس کا لقب بھی خودساختہ ہونے کے بجائے قرنِ اول ہی کا تجویز کردہ ہونا چاہیے تھا!

پس اس صورت میں کہ یہ لقب حدیث نبوی اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہوکر قرنِ اول ہی سے شائع شدہ تھا، جو عین منشائے نبوت اور عین مرضیِ خداوندی ہے، تو انھیں کیا مصیبت تھی کہ وہ اس ماثور اور جامع لقب کو چھوڑ کر مصنوعی اور اکھری قسم کے القاب پر آتے، اور قدیم جماعت ہوتے ہوئے اپنے اوپر جدید جماعت ہونے کا لیبل چسپاں کرتے، اور اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً ﴿أتستبدلون الذی ھو أدنی بالذی ھو خیر﴾ (البقرة ٦١) کے مصداق بنتے، جو کفرانِ نعمت ہوتا!

اسلام کا مظہر اول اور موردِ کامل

بہر حال، ان روایات اور واقعات کی رو سے طبقۂ اہل السُّنۃ والجماعۃ اسماً ورسماً، صورتاً وحقیقتاً، ذوقاً ومشرباً، لوناً وصبغتاً، قدیم اور اصل فرقہ ثابت ہوجاتا ہے، جو اسلام کا وہ اصل حصہ ہے، جس کے پیکر میں شروع ہی سے اسلام نمایاں ہوا، اس لیے وہ قرنِ اول ہی میں وجود پذیر ہوا، قرنِ اول ہی میں اس کا لقب اور مسلکی عنوان تجویز ہوا، اور قرنِ اول ہی میں وہ صحابہ کرام میں شائع اور مشہور بھی ہوگیا، جو اس کی قدامت اور

اصلیت کی واضح دلیل ہے؛ اور کھل جاتا ہے کہ یہ گروہ بعد کے نظریات کی پیداوار نہیں، کہ اس پر کسی جدت وبدعت یا زیغ اور کج روی کی تہمت آئے؛ بل کہ ایک اصلِ ثابت ہے، کہ اس سے ہی منحرف ہو کر زیغ زدہ فرقے بنے اور اس کے خلاف پر قائم ہوئے، نہ کہ وہ کسی کے خلاف یا کسی منفی پہلو پر قائم ہوا؛ اس لیے یہ لقب "اہل سنت والجماعت" مسلکِ ہدایت کے ان دو عنصروں (کتاب اور شخصیت) کے جمع ہو جانے کی وجہ سے قرآنی بھی ہے، حدیثی بھی ہے، فقہی بھی ہے اور سلفی بھی ہے جو اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہی فرقہ اسلام کا مظہر اول اور موردِ کامل ہے۔

اہل سنت والجماعت مکمل اسلام کی ترجمان ہے

پھر لقب اور لقب کے بنیادی عناصر ہی کے لحاظ سے یہ فرقہ مظہر اسلام نہیں بنا؛ بل کہ دین کی بنیادی غرض وغایت کے لحاظ سے بھی اسلام کا مظہر اتم ثابت ہوا؛ کیوں کہ جو غرض وغایت قرآنِ حکیم نے اس فرقۂ حقہ کی بہ ذیلِ جمعِ کتاب وشخصیت قرار دی ہے، یعنی عدل واعتدال، وہی بعینہٖ پورے اسلام کی بھی قرار دی ہے؛ چناں چہ قرآنِ حکیم میں جہاں ان دونوں عناصرِ ہدایت (ارسالِ رسل اور انزالِ کتب) یعنی قانون اور شخصیت کے اجتماع واقتران کی غرض، عدل وقسط قرار دی ہے، جو اس آیت اقتران میں بہ صراحت موجود ہے کہ ﴿لیقوم الناس بالقسط﴾ (الحدید ۲۵) وہی غرض وغایت پورے اسلام کی بھی کتاب وسنت نے ظاہر فرمائی ہے، کہ اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ بنی آدم اعتدال پر قائم رہیں، جس میں افراط وتفریط نہ ہو، چناں چہ قرآنِ حکیم نے مختلف عنوانوں سے اس مقصد پر جگہ جگہ روشنی ڈالی ہے، اور فرمایا:

١ ـ إن الله يأمر بالعدل والإحسان (النحل ٩٠) — بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں انصاف کرنے کا (اور ہر کام اور ہر معاملے کو) اچھا کرنے کا۔

٢ ـ إعدلوا هو أقرب للتقوى (المائدة ٨) — انصاف کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

٣ ـ وأمرت لأعدل بينكم (الشورى ١٥) — اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں۔

٤ ـ إن الله يحب المقسطين (الحجرات ٨) — بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔

٥ ـ كونوا قوامين بالقسط شهداء لله (النساء ١٣٥) — انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ تعالیٰ کے لیے گواہی دینے والے بنو۔

٦ ـ قل أمر ربي بالقسط (الأعراف ٢٩) — فرما دیجیے کہ میرے پروردگار نے عدل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اسی کے ساتھ حدیثِ نبویؐ میں بھی اسلام کے عقیدہ وعمل کے بارے میں یہی ارشاد ہے کہ:

لاتشددوا فيشدد الله عليكم (١) — (دین کے بارے میں اپنے اوپر) تشدد نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی فرمانے لگیں۔

---

(١) أبوداؤد، كتاب الأدب عن أنس مرفوعاً، رقم ٤٩٠٣، لیکن الفاظ میں کچھ فرق ہے، پوری حدیث اس طرح ہے، "لاتشددوا على أنفسكم فيُشَدَّدَ عليكم، فإن قوما شدّدوا على أنفسهم فشدّد الله عليهم، فتلك بقاياهم في الصوامع والديار، رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم"

اور

من شاق شاق الله علیه (۱) جو (لوگوں کو) مشقت میں ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس پر مشقت ڈال دیتے ہیں

اسی طرح عدل کی ضد افراط وتفریط اور غلو ومبالغے سے ابواب دینی میں بہ شدتِ تمام روکا گیا ہے، جس کا حال وہی عدل وقسط کا اثبات ہے۔ فرمایا:

۱۔ لاتغلوا فی دینکم/المائدة ۷۷ تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو۔

۲۔ یا مثلاً جہری نمازوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

لاتجهر بصلاتك ولاتخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلاً (الإسراء ۱۱۰) نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھو اور نہ بالکل چپکے چپکے بالکل ہی دھیمی آواز سے پڑھو، دونوں کے درمیان ایک (معتدل) طریقہ اختیار کرو۔

۳۔ خرچ کرنے کے بارے میں فرمایا:

لاتجعل يدك مغلولة إلى عنقك ولاتبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا / الإسراء ۲۹ اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو (کہ ایک پائی بھی ہاتھ سے نہ نکلے) اور نہ بالکل ہی ہاتھ کو کھول دو (کہ سب کچھ لٹا دو) اور الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھے رہو۔

۴۔ فکریات کے بارے میں فرمایا کہ

---

(۱) أبوداؤد، كتاب القضاء، رقم ۳٦۳۵ بلفظ "من ضارَّ أضرالله به، ومن شاق شاق الله عليه" وترمذی، كتاب البر الصلة (۱۹٤۰) اس کے الفاظ یہ ہیں "من ضارّ ضارّ الله به، ومن شاق شق الله عليه" و ابن ماجه، كتاب الاحكام (٤۲۲۳) بلفظ "من ضارّ أضر الله به، و من شاقّ شقّ الله عليه"۔

ولاتطع من أغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه و کان أمره فرطا / الکهف ۲۸

اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے، اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا حال حد سے گزر گیا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ اور احادیثِ نبویہ سے واضح ہے کہ عبادات و معاملات، اخلاق و ملکات، مالیات و اقتصادیات، افکار و نظریات اور عام دینیات میں اسلام کا بنیادی مقصد یہی عدل و اعتدال ہے، غلو و مبالغہ اور تشدد و انتہا پسندی نہیں۔ اب جب کہ یہی مقصد بعینہٖ اس جامعِ ذات و کتاب مسلکِ اہل سنت والجماعت کا بھی ہے، جس کے تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات میں یہی روحِ عدل و اعتدال دوڑی ہوئی ہے، جو ان دونوں عنصروں کے جمع رکھنے میں ہی پنہاں ہے، جو غیر اہل سنت والجماعت میں نہیں پائی جاتی، جو ان دونوں عنصروں یا ان میں سے کسی ایک سے خالی ہیں؛ تو اس سے واضح ہے کہ یہ اکہرے یا دونوں سے خالی طبقے نہ غلو و مبالغے سے خالی ہیں، نہ شدت و تشدد سے؛ اس لیے یقیناً وہ اس عدل و اعتدال سے بھی خالی ہیں، جو کتاب و سنت نے اسلام کا اور اس جامع فرقے کا واحد نصب العین ظاہر فرمایا ہے؛ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ حدیثِ نبویؐ میں بہتر فرقوں کے لیے تو فرمایا گیا کہ "کلها فی النار" (یہ سارے فرقے بہ لحاظِ عقائد ناری ہیں) تو بدیہی طور پر صرف اسی ایک فرقے یعنی اہل سنت والجماعت کا ناجی ہونا کھل جاتا ہے، جسے إلا واحدة فرما کر ناری ہونے سے مستثنیٰ فرمایا گیا، جس کی تشخیص ما أنا علیه و أصحابی سے فرمائی گئی۔

اندریں صورت اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ پورا اسلام یہی طریقۂ اہل سنت والجماعت ہے جس میں مآ اور آنا دونوں جمع ہیں!!۔

ضمیمہ

"اہل السنۃ والجماعۃ" تین لفظوں سے مرکب ہے، "اہل" کے معنی اشخاص، مقلدین، اتباع اور پیرو کے ہیں۔ "سنت" عربی میں راستے کو کہتے ہیں، اور مجازاً روشِ زندگی اور طرزِ عمل کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے۔ سنت سے مقصود عام سنت نہیں، بلکہ اصطلاحِ دینی میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز زندگی اور طریق عمل کو "سنت" کہتے ہیں۔ "جماعت" کے لغوی معنی تو گروہ کے ہیں، لیکن یہاں جماعت سے مراد "جماعتِ صحابہ" ہے۔

اس لفظی تحقیق سے "اہل السنۃ والجماعۃ" کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے، یعنی یہ کہ اس فرقہ کا اطلاق ان اشخاص پر ہوتا ہے، جن کے اعتقادات، اعمال اور مسائل کا محور، پیغمبر علیہ السلام کی سنت صحیحہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اثر مبارک ہے۔

صحیح مسلم میں آپ کا وہ خطبہ مذکور ہے، جس کو دیتے ہوئے آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں، آواز بلند ہو جاتی تھی، اور لہجہ غضب ناک ہو جاتا تھا:

أما بعد! فإن خير الحديث كتاب الله، وخير الهدى هدى محمد، وشر الأمور محدثاتها، و كل بدعة ضلالة (مسلم)

نیز فرمایا: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، و كل بدعة ضلالة. (احمد وابو داؤد)

إياكم والمحدثات، فإن كل محدثة ضلالة (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

اس قسم کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں۔ ان روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "نئی بات" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے موقعوں پر آ گئی ہے:

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد (بخاری)

من عمل عملاً ليس عليه أمرنا فهو رد (مسلم)

من صنع أمراً على غير أمرنا فهو رد (ابوداؤد)

کسی قوم میں اصلاح کے ظہور کے بعد فسادِ کار کیوں کر راہ پاتا ہے، شارع اسلام علیہ الوف التحیۃ والسلام اس سے بے خبر نہ تھے، فرمایا:

مامن نبي بعثه الله في أمة قبلي، إلا كان له من أمته حواريون وأصحاب يأخذون بسنته ويقتدون بأمره؛ ثم إنها تخلف من بعدهم خلوف يقولون ما لايفعلون،ويفعلون مالا يؤمرون، فمن جاهد هم بيده فهو مومن ،ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن، وليس وراء ذلك من الإيمان حبة خردل. (مسلم)

اسلام دنیا کے تفرقوں کو مٹا کر، تمام دنیا کی ایک عمومی برادری قائم کرنے آیا تھا، وہ آیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، اس نے عرب کے متفرق قبائل کو جو باہم دشمن یا کم از کم نا آشنا تھے، ان کی قبائلی تقسیم کو مٹا کر صرف ''جامعۂ اسلام'' کے ایک رشتے میں ان کو باہم متحد کر دیا، مہاجرین وانصار میں وہ اخوت پیدا کر دی، کہ نسبی برادریاں اس کے آگے ہیچ ہو گئیں۔

کسی قوم میں کوئی ترقی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک اس کے تمام افراد کسی ایک نقطے پر باہم اس طرح مجتمع نہ ہو جائیں، کہ وہ ''نقطۂ اجتماع'' ان کی زندگی کا اصل محور بن جائے۔ اس کا تحفظ، اس کی بقا اور اس کا وجود، تمام افراد قوم کی زندگی کی غرض اصلی بن جائے۔ اس وقت اس مجموعۂ افراد کو ایک قوم کہا جا سکتا ہے، اور وہی ''نقطۂ اتحاد'' ان کا شیرازۂ قومیت، رشتۂ جامعیت اور رابطۂ وحدت قرار پائے گا۔ کسی قوم کی تباہی کا اصل سبب یہی ہوتا ہے، کہ اس کی قومیت کی یہ گرہ کھل جاتی ہے، اور تمام مجتمع افراد اس طرح متفرق و منتشر ہو جاتے ہیں، کہ ہوا کا ایک ادنیٰ جھونکا ان کو بکھیر دیتا ہے۔

اسلام نے جغرفیائی اور نسلی امتیازات کو جس کے اندر کبھی تمام دنیا نہیں سما سکتی، مٹا کر مذہب کو ''جامعۂ ارتباط'' اور ''رابطۂ جامعیت'' قرار دیا، تا کہ جس حصے اور انسانوں کی جن نسلوں تک بھی اس کا دائرہ وسیع ہو، وہ ایک بڑی برادری کے اندر داخل ہو جائیں۔

اسلام نے بآواز بلند کہا ''إنما المؤمنون إخوة (حجرات)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں اس کی تفسیر فرمائی ہے۔ نیز ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کی نسبت آپ ﷺ نے فرمایا ''إن الله لا يجمع أمتي على الضلالة ،ويد الله على الجماعة، ومن شذ شذ في النار (ترمذی)

تفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة،ثنتان وسبعون في النار وواحدة في الجنة، وهي الجماعة (ابوداؤد)

اس معنی کی اور بہت سی حدیثیں مروی ہیں، ان سے ''اہل السنۃ'' کے بعد ''والجماعۃ'' کی تفسیر ہوتی ہے۔

(علامہ سید سلیمان ندوی، رسالہ اہل السنت والجماعت ص ۸-۱۴ ملخصاً)

ادارۂ احیاءِ علم و دعوت ۔ لکھنؤ

مقاصد اور منصوبے

- قدیم کتابوں کی تحقیق واشاعت، جن کی علمی یا دعوتی لحاظ سے اس وقت ضرورت ہے
- "سلسلة أعلام المسلمين فى الهند" کے تحت عربی میں تحقیقی کتابوں کی ترتیب واشاعت
- ایک علمی و تحقیقی رسالے کا اجرا
- نوجوان اہل قلم کی ہمت افزائی اور ٹریننگ
- فارغین مدارس کو علمی اور دعوتی مقاصد سے وابستہ کرنے کی کوشش
- طریقۂ کار سے قطع نظر، تمام دعوتی کام کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی اور حتی الوسع تعاون
- اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کو اُردو زبان سکھانے اور دین پر قائم رکھنے کی
- غیر مسلم طلبہ کی ذہن سازی اور اسلام سے متعلق بنیادی معلومات کی فراہمی
- اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ اور تمام غیر مسلم حلقوں میں تعارف اسلام کی کوشش
- تاریخ اسلام، بالخصوص ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے متعلق غلط بیانیوں کی تصحیح، اور صحیح معلومات کی ترتیب واشاعت
- کارآمد اُردو، فارسی، عربی، انگریزی اور ہندی کتابوں کی دوسری ضروری زبانوں میں ترجمانی

DESIGNED BY HAMID PRINTED AT: KAKORI OFFSET PRESS, Lko.